اسلامی نظام

(از)

حکیم محمد اسحٰق سندھیلوی

قیمت (عہ)

جملہ حقوق محفوظ

مطبوعہ

مطبع مکتبہ ابراہیمیہ
حیدرآباد دکن

تعداد اشاعت ...... (۱۰۰۰) ہزار

۳۰ مارچ سنہ ۱۹۲۵ء

موت سے ہمکنار دنیا کیلئے آبحیات

"اسلامی نظام"

(رائج الوقت نظاموں کے تلخ تجربات اور ہولناک نتائج سے تنگ آکر دنیا ایک صحیح اور صالح نظام کی ضرورت محسوس کر رہی ہے اور عنقریب اور زیادہ شدت سے اس ضرورت کو محسوس کرے گی ہمارے نزدیک دنیا کے امن وچین اور عالم کی دائمی فلاح کا ضامن صرف ایک ہی نظام ہے اور وہ خالق کائنات کا بتلایا ہوا نظام ہے ―― (اسلامی نظام) ―― اس وقت ہمارا خصوصی فریضہ ہے کہ پوری قوت سے اس کو دنیا کے سامنے پیش کریں اور اس کے برسر کار لانے کیلئے ہر ممکن جدوجہد کریں ―― ذیل کا مضمون اسی فریضہ کی ادائیگی کی ایک ضروری کوشش ہے واللہ الموفق)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی آللّٰہُ خَیْرٌ اَمَّا یُشْرِکُوْنَ ؕ

بلا کسی طویل یا مختصر تمہید کے ہماری دعوت تمام ابنائے جنس کو "اسلامی نظام" کی طرف ہے جو کسی ہم جیسے محدود العلم اور ناقص الفہم انسان کے

غور و فکر کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ہمارے اور سب کے خالق بے ہمتا کا بنایا ہوا اور بتلایا ہوا ہے۔ ہم پوری دیانتداری کے ساتھ محسوس کرتے ہیں اور اس پر غیر متزلزل یقین رکھتے ہیں کہ زمانہ خواہ ہزار چکر کاٹے اور لاکھ گردشیں کھائے آخراً اس کو امن و فلاح اپنے خالق و مالک کے بنائے ہوئے اسی نظام میں مل سکے گی۔ ہماری دعوت براہ راست اسی کی طرف ہے اور بہ توفیق خداوندی ہماری جدوجہد اسی کے لئے ہوگی۔

ہمارا مقصد

اس "نظام" کی طرف دعوت اور اس کی ترویج و اقامت کیلئے جدوجہد سے ہمارا مقصد نہ قومی ہے نہ جماعتی، نہ وطنی نہ طبقاتی۔ ان محدود اور خود غرضانہ مقاصد سے ہم کو دور کا بھی واسطہ نہیں ہے بلکہ ہمارا مقصد اس سے بہت اعلیٰ اور اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ ہم تو بس یہ چاہتے ہیں کہ کل بنی نوع انسان ترقی و فلاح کے اعلیٰ ترین منازل و مدارج حاصل کریں اور راحت و اطمینان کی دولت سے مالا مال ہوں پھر یہ ترقی کسی ایک شعبہ زندگی ہی میں نہ ہو بلکہ انسانی حیات کے ہر شعبہ اور ہر شاخ میں ہو۔ اسی طرح یہ ترقی محدود بھی نہ ہو یعنی موت بھی اس کی حدبندی نہ کر سکے بلکہ اس کے بعد بھی یہ ترقی جاری رہے۔ موت اس میں مزاحم نہ ہو بلکہ معاون ہو اور اس کے بعد انسانی ارتقاء اور راحت و اطمینان کا وہ دور شروع ہو جس کا انقطاع کبھی نہ ہو سکے۔

اس اقدام کا محرک

یقین کیا جائے کہ ہمارے اس اقدام کی محرک کسی نوع کی عصبیت نہیں ہے نہ قومی نہ جماعتی نہ وطنی نہ طبقاتی نہ ہمارا یہ مقصد ہے کہ ہم دنیا کی کسی قوم کو غلام بنالیں نہ ہم کسی تجارتی منڈی پر قابض ہونا چاہتے ہیں نہ پیڑول کے چشموں، لوہے، کوئلے اور دیگر اشیاء کی کانوں کی خواہش ہم کو اس کام کے لئے ابھار رہی ہے۔ غرض کسی قسم کی شخصی یا جماعتی طمع اس کی محرک نہیں ہے اسی طرح غیر مسلم اقوام سے خوف و ڈر یا ان سے نفرت واحتراز بھی اس کا محرک نہیں ہے۔ ہم نہ "پاکستان" قائم کرنا چاہتے ہیں نہ کونسلو اسمبلیوں وغیرہ میں نشستیں محفوظ کرنا چاہتے ہیں۔

نہ ہم مسلمانوں کو ان معنی کے لحاظ سے کوئی قوم ہی سمجھتے ہیں جو آج کل دنیا میں قومیت کے معنے لئے جاتے ہیں اس لئے اس کے تحفظ کی خواہش بھی ہم کو اس پر آمادہ نہیں کر رہی ہے بلکہ ہم مسلمانوں کو ایک امت اور جماعت سمجھتے ہیں جو ایک خاص نظریہ حیات اور نظام زندگی کی علمبردار اور مبلغ ہونے کی بناء پر وجود میں آئی ہے۔ اور یہی اس کا مشن ہے

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتومنون باللہ ؕ

اس جماعت کے ہم بھی ممبر ہیں اور اپنا یہ فرض اور مقصد حیات سمجھتے ہیں کہ تحریک اسلام کو دنیا کے سامنے پیش کریں اور اسلامی نظام حیات کو

دنیا میں رائج کرنے کی کوشش کریں۔ جس طرح ایک اشتراکی اشتراکیت کے اصول و نظام حیات کو دنیا میں رائج کرنا چاہتا ہے ہم بھی اسی طرح اسلامی اصول و نظام حیات کو عالم میں رائج کرنا چاہتے ہیں۔ الغرض اس اقدام کا پہلا محرک تو یہ احساس فرض ہے جو مومن باللہ اور مسلم للہ ہونیکی بناء پر ہم پر عائد ہوتا ہے اور آیت اظہار دین (ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ) میں جس کو مقصد بعثت محمدی بتلایا گیا ہے۔

دوسرا محرک اس جد و جہد کا ہمدردی و محبت کا وہ جذبہ ہے جو فطری طور پر ہر انسان (خصوصاً صاحب ایمان) کے دل میں کل بنی نوع انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آج دنیا مصائب و آلام میں مبتلا ہے پریشانی بے اطمینانی تکلیف و مصیبت کی کالی گھٹائیں کل عالم پر چھائی ہوئی ہیں اور انسانوں پر ٹوٹ ٹوٹ کر برس رہی ہیں یہی نہیں بلکہ نوع انسان ایک ایسی بڑی مصیبت کی طرف جا رہی ہے جس میں مبتلا ہو کر اس کو کبھی اس سے چھٹکارا نہ ملے گا اور جس کی شدت کے آگے دنیا کی یہ ساری مصیبتیں بالکل ہیچ ہیں بنی آدم کی ان مصیبتوں کو دیکھ کر ہمارا دل دکھتا ہے اور ہم کو اس امر پر مجبور کرتا ہے کہ ہم دنیا کو وہ نسخہ حیات بتا دیں بلکہ ہو سکے تو اس کو وہ دوا ہی پلا دیں جس کا استعمال دنیا کے ان امراض کا تنہا علاج اور ان کے دفعیہ کا واحد ضامن ہے، اور جو دنیا کو تنزل و ادبار کے راستہ سے ہٹا کر دائمی اور غیر منقطع عروج و ارتقاء کی طرف یقینی طور پر لیجانیوالا ہے۔

تیسرا محرک نوعی انتفاع کا فطری احساس ہے یعنی ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات عالم باوجودیکہ نوع انسانی کے نفع کے لئے پیدا کی گئی ہے مگر دنیا کے غلط ادراک، غلط طریق استعمال اور غلط نظام ہائے حیات کی وجہ سے وہ نوع انسانی کے لئے نافع ہونے کے بجائے اس کے ضرر، اس کی ہلاکت اور اس کے تنزل کا سبب بن رہی ہے کائنات کے استعمال کے صحیح اور اعلیٰ اصول کا علم اللہ تعالیٰ نے ہم کو دیا ہے اس لئے عقلاً بھی یہ فرض ہم پر عائد ہوتا ہے کہ ہم ان اصولوں سے دنیا کو آشنا بنائیں تاکہ نوع انسان کائناتِ عالم سے بہترین منافع حاصل کر کے علمی، فکری، اخلاقی، معاشی، سیاسی، صنعتی غرض ہر شعبہ حیات میں اعلیٰ ترین منازل ارتقاء پر پہونچ سکے۔ اور دائمی تنزل و ادبار سے محفوظ رہ سکے۔

اوپر کے بیان سے یہ چیز بالکل صاف ہو گئی اور یہی ہمارا مقصد تھا کہ اسلامی نظام کی ترویج یا خلافتِ الٰہیہ کے قیام سے کسی وحشت اور خوف کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ نہ اس سے مسلمانوں کو ڈرنے کی وجہ ہے نہ غیر مسلموں کو اس کا نفع دونوں کے لئے یکساں ہے اس کی منفعت کے لئے کسی نسل، کسی وطن، کسی قوم، کسی رنگ، کسی طبقہ کی قید نہیں ہے اس سے ہر وہ شخص نفع اٹھا سکتا ہے اور اٹھائے گا جو اس نظام میں خود کو منسلک کرے۔ اس لئے ہم اس نظام کی طرف دنیا کے ہر اس انسان کو دعوت دیتے ہیں جو انسانیت و نوع انسانی کی بقاء و ترقی چاہتا ہے، اپنے ابناء جنس کے ساتھ ہمدردی رکھتا ہے اور کل نوع انسانی کی فلاح و بہبود اور راحت و اطمینان کا خواہشمند

ہے اس لئے کہ اسلامی نظام کے سوا دنیا کا کوئی نظام ایسا نہیں ہے جس کا افادہ اس قدر عام اور کل نوع انسانی کو شامل ہو جو مزدور و سرمایہ دار دونوں کو یکساں مطمئن اور خوش کر دے جو زمیندار و کاشتکار دونوں کیلئے یکساں طور پر مفید ہو۔ جو رذیل و شریف کے جاہلی فرق کو مٹا دے اور جو پشتینی دشمنوں کو دوست اور محب صادق بنا دے اور ان کے درمیان عداوت و نفرت کے بجائے الفت و مودت کا مضبوط رشتہ قائم کر دے۔

اس اسلامی نظام کا تجربہ

یہ نظام جو ہم دنیا میں رائج کرنا چاہتے ہیں محض خیالی چیز نہیں ہے بلکہ مکمل طور پر عملی شئے ہے۔ اس پر عمل کرنا نہ صرف ممکن ہے بلکہ اس پر عمل ہو بھی چکا ہے اور اس کا عملی نمونہ ہمارے سامنے پیش کیا جا چکا ہے۔ سر سے لے کر پیر تک اور شاخ سے لے کر جڑ تک اس نظام کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے جس پر عمل کر کے ہم کو دکھا نہ دیا گیا ہو۔ لیکن اس نمونہ کی تلاش کے لئے ہرگز اپنے ذہن کو اکبری، جہانگیری، شاہجہانی یا اسی طرز کے کسی دوسرے عہد کی جانب نہ لیجائیے۔ اسی طرح مصطفیٰ کمال، رضا شاہ، یا دوسرے مسلمان سلاطین و آمرین کے یہاں بھی اس کا نمونہ تلاش کرنا نہ صرف عبث بلکہ گمراہی و غلط فہمی کا سبب ہوگا۔ اس نظام کا نمونہ صرف عہد محمدی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے خلفائے راشدین کے زمانہ میں موجود تھا۔ اس عہد کے بعد بھی اس کے جزوی نمونے ہوئے ہیں مگر کامل نمونہ صرف

مذکور الصدر زمانہ میں ہی پایا گیا ہے اس لئے ہر مسلمان اور نامسلمان کی یہ غلط فہمی رفع ہو جانا چاہیے کہ ہم ان کو عہد شاہجہانی یا جہانگیری قسم کے کسی عہد کی جانب لے جانا چاہتے ہیں یا جمہوریہ ترکیہ کا چربہ اتارنا چاہتے ہیں یا کسی اور کی طاقت سے ہندوستان کو دوسرا مصر بنانا چاہتے ہیں۔ یہ سب باتیں ہمارے اصول کے خلاف اور ہمارے مقصد سے تضاد کی نسبت رکھتی ہیں۔ ہم تو خدا کے آخری رسول اور دنیا کے لئے رضاء الہی کے آخری نمائندے حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ارشد خلفا حضرت صدیق اکبر و فاروق اعظم کے عہد معدلت کے نمونہ پر ایک "نئی دنیا" کی بنیاد ڈالنا چاہتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ بات بڑی ہے اور ہمارا منہ چھوٹا۔ اس لئے صرف اللہ ہی سے مدد اور توفیق کے طالب ہیں اس کی مدد شامل حال ہو تو ذرہ کو آفتاب بنتے کیا دیر لگتی ہے۔ پھر خاص اس مقصد میں مدد کرنے کا تو اس کا محکم وعدہ بھی ہے فقد قال وھوا صدق القائلین وکان حقاً علینا نصر المؤمنین ہ

حیات نو کا پیغام

یہ "اسلامی نظام" انسان اور انسانیت کیلئے نیا ہے؟ میں کہوں گا کہ یہ ان کے لئے ایک نئی زندگی کا پیغام ہے جس کا تصور صرف ایمانی روشنی سے معمور دل و دماغ ہی کر سکتا ہے یہ نئی زندگی ہی اس نئے نظام کی روح اور اس کا ماحصل ہے۔ یہ "حیاتِ نو" کیا ہے؟ اس کے سمجھنے

کے لئے انسانی حیات کی تحلیل کی ضرورت ہے۔

حیاتِ انسانی کی تقسیم

انسانی زندگی بظاہر ایک بسیط شئے ہے لیکن اس کی یہ بساطت محض اصطلاحی ہے ورنہ درحقیقت اس کی تقسیم دو حصوں یا دو قسموں کی جانب ہو جاتی ہے۔ انسانی حیات کی یہ دونوں قسمیں اس کی حیاتِ عقلی اور "حیاتِ طبعی" ہیں انگریزی میں ان کا ترجمہ بالترتیب (Physical life) اور Rational life ہو سکتا ہے ٭

حیاتِ طبعی کیا ہے

اگرچہ حیات کی حقیقت ایک عقدہ لاینحل ہے لیکن اس کے مظاہر بالکل بدیہی ہیں اور ان سے ہم کو اس کی اتنی معرفت ہو جاتی ہے جو ضرورت کے لئے کافی ہے۔ ہماری زندگی عموماً اسی کے مظاہر سے پُر ہوتی ہے،

٭ حیاتِ عقلی کا ترجمہ "ریشنل لائف" اس کا مفہوم مکمل طور پر شاید نہیں ادا کرتا۔ انگریزی میں مہارت رکھنے والے اصحاب اگر اور کوئی لفظ مناسب سمجھتے ہوں تو اسے اس کی جگہ رکھدیں۔ درحقیقت جب یہ چیز ہی اس زبان میں مفقود ہے تو اس کے لئے صحیح لفظ ملنا بھی دشوار ہے اس لئے محض قریب المعنی لفظ پر اکتفا کرنا پڑتا ہے ۱۲

ہمارے جسم کا نشو ونما، تغذیہ، دفع فضلات، جذب ضروریات نظام عصبی کا سکون و اضطراب اوتار و رباطات کی حرکت و قوت اور ان چیزوں سے آگے بڑھ کر طبعی جذبات و احساسات مثلاً غذا کی خواہش (Hunger) قربت صنف مقابل کی خواہش (Sex) اور ان خواہشوں کے پورا کرنے میں جو شئے مزاحم ہو اس پر غضب و غصہ کا ابھرنا، اسی طرح ان کے ذیل میں جو خواہش یا جذبات و احساسات آتے ہیں مثلاً محبت، دشمنی، نفرت، حسد وغیرہ نیز ان کے دیگر متعلقات سب کے سب ہماری حیات طبعی ہی کے مظاہر ہیں۔

108/072
9174

حیاتِ عقلی کیا چیز ہے

جہاں تک انسان کی حیات طبعی کا تعلق ہے اس میں اور حیوانات میں کوئی حقیقی فرق نہیں ہے، بلکہ نباتات سے بھی اس لحاظ سے اس کا امتیاز محض اتنا ہے کہ وہ ایک بڑے درجہ کا جسم نامی ہے۔ یہی نہیں بلکہ زندگی کی اس نوع کے لحاظ سے انسان حیوانات سے بھی ایک درجہ نیچے گرا ہوا نظر آتا ہے، اس لئے کہ حیوانات کی حیات طبعی ان میں ایک حس بھی پیدا کرتی ہے جو ان کے سامنے مضر اور نافع کو ایک دوسرے سے ممتاز کر دیتی ہے۔ ایک حیوان عام حالتوں میں اسی قدر کھاتا ہے جس قدر اس کے لئے ضروری ہے۔ اسی قدر پانی پیتا ہے جس قدر اس کو احتیاج ہے۔ اس کی جنسی خواہشات (Sexual Desire) بھی وقت، موسم

اور ضرورت کے تابع ہوتی ہیں موسمی حالات کے لحاظ سے وہ اپنے حرکات و سکنات میں تبدیلی پیدا کر لیتا ہے اور ان تغیرات کا اندازہ اس کو انسان سے بہت پہلے ہو جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے طبعی احساسات اس قدر تیز ہوتے ہیں کہ عموماً حیوانات صرف وہی چیزیں کھاتے پیتے ہیں جو ان کے لئے مفید ہوتی ہیں اور مضر چیزوں سے خود بخود متنفر ہوتے ہیں خواہ وہ بظاہر کتنی ہی عمدہ کیوں نہوں بعض حیوانات ان معاملات میں بہت آگے بڑھے ہوئے ہیں مثلاً بندر سم آمیز (زہریلی ہوئی) شے کو سونگھ کر اس کے زہر کا اندازہ کر لیتا ہے۔ کتا بو سونگھ کر اور آنکھ سے دیکھ کر دوست دشمن کا اندازہ کر لیتا ہے۔ بلکہ انسان کی بہت سی باطنی کیفیات کو خوب سمجھ لیتا ہے۔ اسی طرح محض سونگھ کر وہ گم شدہ آدمیوں نیز مقامات کو تلاش کر لیتا ہے[1] نحل (شہد کی مکھی) کا سارا محیر العقول کارخانہ اس کی حیات طبعی ہی کا کرشمہ ہے۔ الغرض جہاں تک طبعی قوتوں کا تعلق ہے حیوانات کو اس حیثیت سے انسان پر بہت کچھ فوقیت حاصل ہے کہ وہ محض طبعی طور پر اپنے ضرر و نفع کا اندازہ خوب کر لیتے ہیں اور انسان

---

[1] یورپ و امریکہ میں ایسے کتے بکثرت موجود ہیں جو سینکڑوں میل دور جا کر چوری کا مال پکڑواتے ہیں اور دور دراز علاقوں تک نامعلوم یا مفرور قاتلوں اور مجرموں کا سراغ لگا لیتے ہیں۔

طبعًا اس پر قادر نہیں ہے اسی طرح وہ طبعًا ایک قانون کے پابند ہیں جو ان کے افعال و حرکات میں ایک ربط اور نظم پیدا کرتا ہے اور اس کو باقی رکھتا ہے بخلاف اس کے انسان طبعی طور پر اس قسم کے قانون سے قطعًا آزاد ہے۔ وہ ہر وہ چیز کھاتا ہے جو اس کو لذیذ معلوم ہو خواہ وہ اس کے لئے کتنی ہی مضر کیوں نہ ہو میلان جنسی کا بھی اس کے لئے کوئی قانون نہیں ہے وقت و موسم کی قید سے وہ آزاد ہے۔ اس کے جسم پر کوئی ایسی شے نہیں ہے جو اس کو موسمی اثرات سے محفوظ رکھ سکے۔ الغرض وہ طبعی طور پر اس قسم کی کوئی حس (instinct) نہیں رکھتا ہے جو زندگی میں اسکی رہنمائی کر سکے۔ اس لئے اس کو ایسے قوانین کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کے افعال و حرکات میں نظم و ربط پیدا کریں اور اس کو مضر اور نافع میں امتیاز و فرق کرنے کے لئے معیار کا کام دیں ــــ یہیں سے انسان کی عقلی حیات کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں اس کو عقل کی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے کہ جیسا کہ کہا گیا ہے اس کے پاس عقل کے سوا اور کوئی ایسا آلہ ہے ہی نہیں جو اس کام میں اس کے لئے مفید ہو۔ اگر وہ اس مرحلہ پر اپنی عقل سے کام نہ لے تو اس کی ہلاکت (خواہ شخصی حیثیت میں ہو یا اجتماعی حیثیت میں) یقینی و لابدی ہے۔ کیونکہ اس کی طبعی خواہشیں جو ہر طبعی پابندی یہاں تک کہ اس کی طبعی قوتوں کی پابندی سے بھی آزاد ہیں حد افراط پر پہنچکر اس کے قویٰ کو فنا کر دینگی اور اس کا نتیجہ شخصی یا قومی ہلاکت کی صورت میں نکلنا بالکل بدیہی شے ہے۔ علیٰ ہذا ضرر اور نفع میں

عدم امتیاز کی وجہ سے قوی بلکہ یقینی اندیشہ ہے کہ وہ زیادہ تر ضرر اٹھا ئے گا اور کائنات سے نفع نہ حاصل کر سکے گا۔ گویا حیاتِ عقلی انسانی زندگی کا وہ پہلو یا اس کی وہ نوع ہے جس سے انسان اپنی طبعی زندگی پر قابو (Control) رکھتا ہے جس کے ذریعہ سے اس کو منظم (In order) کرتا ہے جس سے اس کے مزاج کو اعتدال پر رکھتا ہے اور جس سے اس کے اوپر ایک نوع کی حکومت Command قائم کرتا ہے۔ زندگی کی یہی قسم یعنی حیات عقلی ہی وہ خط امتیاز ہے جو انسان اور حیوان کے درمیان اللہ تعالیٰ نے کھینچ دیا ہے۔ یہی وہ شے ہے جس کی بنا پر انسان کو انسان کہا جاتا ہے۔ اگر انسان کی اس زندگی پر کوئی آنچ آجائے یا اس میں ضعف پیدا ہو جائے تو انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں باقی رہتا بلکہ انسان حیوانات سے فائق و برتر ہونے کے بجائے ان سے بھی پست تر مرتبہ پر نظر آتا ہے۔ قرآن مجید اسی قسم کے انسان نما حیوانوں کے متعلق کہتا ہے۔

اولٰئک کالانعام بل ہم اضل ؕ

یہ لوگ چار پایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔

حیات عقلی کا منہاج عمل

حیاتِ طبعی کی طرح حیات عقلی کی حقیقت بھی عام انسانی نظر سے مخفی ہے اور شاید ہمیشہ مخفی رہے گی لیکن اس کے مظاہر بہت واضح ہیں اور

انہی کے ذریعہ سے اس کی معرفت ممکن بھی ہے اور کافی بھی ان مظاہر ہی پر غور کرنے سے ہم کو اس کے منہاج (Process of action) کا پتہ چلتا ہے جس کا علم بہت ہی ضروری اور مفید ہے اس کے طرزِ عمل کی توضیح کے لئے بہترین طریقہ تمثیل ہوگا۔ اس لئے ذیل کی مثال سے ہم اس کی توضیح کرنا چاہتے ہیں۔ غذا کا مسئلہ ایک عام اور وسیع مسئلہ ہے جس سے ہر جاندار کو دو چار ہونا پڑتا ہے اس لئے اسی کو مثال میں بیان کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔

ہر جاندار طبعی طور پر غذا کا محتاج ہے۔ انسان میں بھی تغذیہ کی خواہش طبعی ہے مگر طبعاً انسان ہر اس چیز کو غذا بنانے پر آمادہ ہو جاتا ہے جو اس کے حس ظاہری کیلئے تکلیف دہ نہ ہو مثلاً بدمزہ یا بدشکل یا بدبودار نہ ہو اور اس کے پیٹ بھرنے کا کام دے سکے، مگر بہت سی چیزوں کو وہ دیکھتا ہے کہ باوجود اس کے کہ ان میں مندرجہ بالا دونوں شرطیں پائی جاتی ہیں پھر بھی وہ اس کی غذا بننے کی صلاحیت نہیں رکھتیں اس لئے کہ اس کے لئے مضر ہیں یا مہلک ہیں یا اس کے لئے نافع نہیں ہیں یعنی اس میں وہ قوت و طاقت نہیں پیدا کرتی ہیں جو غذا کا مقصود ہے۔ اسی بنیاد پر وہ لذیذ اور پیٹ بھرنے والی اشیاء کو دو قسموں میں تقسیم کر دیتا ہے ایک وہ جو تغذیہ کی صلاحیت رکھتی ہیں اور دوسری وہ جو تغذ کی صلاحیت نہیں رکھتی ہیں۔ چنانچہ وہ اول الذکر کو کھاتا ہے اور ثانی الذکر کو بطور غذا نہیں کھاتا خواہشِ تغذیہ سے لیکر اس تقسیم تک انسان نے بہت سے

اعمال انجام دئے ہیں۔ اس سلسلہ کی مختلف کڑیوں کو الگ الگ کر کے دیکھنے سے پتہ چلیگا کہ ان میں سے اس کی حیات عقلی کے مظاہر کون ہیں اور حیات طبعی کے مظاہر کون سے ہیں اور پھر حیات عقلی کے افعال کس طریق سے انجام پاتے ہیں۔ ذیل کا نقشہ اس کی توضیح کر دے گا۔

(فعل)	کس حیات کا مظہر ہے	(فعل)	(کس حیات کا مظہر ہے)
خواہش غذا	حیات طبعی	مضر یا غیر مفید لذیذ غذا سے احتراز	حیات عقلی
غذا کروہ حسی سے نفرت	"	اغذیہ کی تقسیم مفید و غیر مفید کی جانب	"
لذیذ غذا کی طرف رغبت	"	غذا مفید کی خواہش اور اسکی طرف رغبت	"
مضر یا غیر مفید مگر لذیذ غذا کو کھا لینا		غذا مضر یا غیر مفید سے نفرت یا بے اعتنائی	"

اس نفسیاتی تحلیل (Phisico Analisis) میں ہم نے حیات عقلی اور حیات طبعی کے مظاہر کو الگ الگ کر دیا ہے اب ہم کو یہ دیکھنا باقی رہ گیا کہ حیات عقلی کے یہ مظاہر کس طرح ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اسی نقشہ میں غور کرنے سے یہ چیز بھی واضح ہو جاتی ہے۔ اختصار کے لئے ابتدائی منزلوں کو چھوڑ کر ہم اس درجہ سے چلتے ہیں جہاں سے انسان غذا لذیذ غیر مفید یا مضر کو طبعی خواہش کی بناء پر کھاتا ہے۔ اس سے اس کو مشاہدہ ہوتا ہے کہ وہ غذا اس کے لئے غیر مفید یا مضر ہے۔ اس مشاہدہ سے وہ ایک قانون اخذ کرتا ہے کہ "ہر غذاء لذیذ غذاء مفید نہیں ہوتی یا دوسرے الفاظ میں بعض لذیذ غذائیں غیر مفید یا مضر ہوتی ہیں۔" یہی تقسیم کا عمل ہے پھر اگر

اس قسم کے متعدد مشاہدات ہوں تو وہ غذاؤں کی شکل وصورت یا اور کسی وصف یا اوصاف کے لحاظ سے ان کی تقسیم کر دیتا ہے اور اس قسم کے قوانین اخذ کرتا ہے کہ فلاں قسم کی غذا مضر یا غیر مفید ہوتی ہے اور فلاں قسم کی غذا مفید ہوتی ہے" اور ان قوانین کو آئندہ عملی زندگی میں استعمال کرتا ہے اور انھیں کی بنا پر مفید اغذیہ کی جانب اس کو رغبت اور مضر یا غیر مفید اغذیہ سے اس کو نفرت یا بے اعتنائی پیدا ہوتی ہے۔

اس تفصیل سے یہ صاف طور پر واضح ہو گیا کہ حیات عقلی کے اعمال ان قوانین واصول کے ذریعہ سے ظہور پذیر ہوتے ہیں جو انسانی عقل میں کسی نہ کسی ذریعہ سے موجود ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ قوانین تجربہ، مشاہدہ یا استقرا ہی سے حاصل ہوں بلکہ ان کے حصول کے دوسرے ذرائع بھی ہو سکتے ہیں لیکن یہ ضروری ہے کہ حیات طبعی پر حیات عقلی کا اثر محض قوانین واصول کی بنا پر پڑ سکتا ہے اس کے علاوہ اور کوئی ذریعہ عمل، عقل کے پاس اس کے لئے نہیں ہے۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ حیات عقلی کا صلاح وفساد بھی انھیں قوانین کے حسن وقبح پر موقوف ہے۔ اسی طرح ان قوانین کا صحیح وغلط طریق استعمال بھی حیات عقلی کے صلاح وفساد پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے یہ سب باتیں بالکل بدیہی اور مشاہدہ سے ثابت ہیں اس لئے ان کے لئے کسی استدلال کی حاجت نہیں۔

حیات عقلی کا نظام

ان قوانین کا جن کے ذریعہ سے ہماری حیات عقلی ہماری حیات طبعی پر

اثر انداز ہوتی ہے، باہم مربوط اور منتظم ہونا لازمی اور ضروری ہے۔ اگر ان میں باہم کوئی ربط و تعلق نہ ہوگا تو ہم تشتت افکار کے فکری مرض میں مبتلا ہو جائیں گے جو ہماری حیات عقلی کے لئے انتہائی مہلک شے ہے۔ اس مرض میں مبتلا ہونے کے بعد انسان کی حیات عقلی ایک منٹ کے لئے بھی نہیں قائم رہ سکتی اور نہ وہ اس کی صحیح رہنمائی کر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان فطرتاً اس امر کا عادی ہے کہ اپنے کل افکار میں ایک نظام قائم کرے اور اس کو باقی رکھے۔ چنانچہ جب کسی شخص کے افکار میں کوئی ربط و نظام نہیں قائم رہتا ہے تو وہ طبعی حیثیت سے بھی "مجنون" کہا جاتا ہے بلکہ جنون نام ہی ہے تشتت و پراگندگی افکار کا۔ اور صرف یہ ہی نہیں ہے کہ انسان اپنے افکار میں نظام قائم رکھنا چاہتا ہے بلکہ اس کی یہ خواہش فطری ہونے کی بنا پر اس قدر شدید ہوتی ہے کہ وہ پراگندہ و غیر مربوط افکار کو سننا بھی پسند نہیں کرتا۔ کوئی شخص کسی ایسی کتاب کو پڑھنا نہیں چاہتا جس کے مضامین میں کوئی ربط و نظم نہ ہو اور اس کا مرکزی خیال (Central Idia) واضح نہ ہوتا ہو۔

"اسلام" انسان کے اسی فطری اقتضا کا جواب اور فطرت انسانی کی اسی خواہش کا مداوا ہے۔ وہ انسان کی اسی حیات عقلی کے مکمل نظام کا نام ہے اس کی ابتدا انسان کی فکری زندگی سے ہوتی ہے اور اس کی انتہا ان خطوط پر ہوتی ہے جو انسانی زندگی کے کل شعبوں کو گھیرے ہوئے ہیں۔ انسان کی کوئی حرکت اور اس کا کوئی عمل ایسا نہیں ہے جس کا

تعلق کسی نہ کسی طریق پر اس کی حیات عقلی سے نہ ہو جیسا کہ گزشتہ سطور میں غور کرنے سے واضح ہو سکتا ہے اور یہ تعلق جانبین سے ہوتا ہے۔ یعنی حیات عقلی جس طرح انسان کی فعلی و قولی زندگی کو وجود میں لاتی ہے اسی طرح وہ اس سے خود بھی متاثر ہوتی ہے۔

مرکز کا اقتضا

نظام کی فطرت کا اقتضاء ہے کہ اس کے لئے کوئی مرکز ہو۔ کسی نظام کا مرکز کے بغیر وجود کیا معنی تصوّر بھی نہیں ہو سکتا۔ حیات عقلی کا نظام بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس لئے فطرت انسانی اس امر کی بھی مقتضی ہے کہ افکار انسانی کا ایک مرکز ضرور ہو۔ یہی مرکز افکار درحقیقت انسان کی حیات عقلی اور اس کے کل مظاہر کا مرکز ہوتا ہے خواہ وہ مظاہر داخلی ہوں یا خارجی۔ اسی طرح انسان کی حیات عقلی کی صلاح اور اس کا ارتقاء اسی مرکز کی صلاح اور صحت پر موقوف ہوتا ہے۔ انسان کا مرکز افکار جس قدر بلند ہو گا اسی قدر اعلیٰ درجہ کے قوانین اس مرکز کے گرد گردش کریں گے جو اپنی عظمت اور اپنے علو کی وجہ سے کل انسانی زندگی کو رفعت وارتقاء کی جانب لے جائیں گے۔ اور اس کے برعکس اگر مرکز افکار پست ہو تو انسان کی حیات عقلی صحت و قوت کی حالت میں نہ ہو گی بلکہ پست و ضعیف ہو کر اس کی حیات طبعی پر اقتدار قائم کرنے کے بجائے خود اس کے تابع ہو جائیگی یہاں تک کہ بالآخر فنا اور ہلاکت کے درجہ پر پہونچ جائے گی۔

انسان کے ہر علم و عمل کے لئے اس کا یہ مرکز افکار بمنزلہ بنیاد ا
نقطہ آغاز کے ہوتا ہے۔ اور اس کی پوری حیاتِ عقلی درحقیقت اسی نقطہ
سے پیدا ہوتی ہے۔ جس طرح املی کے ایک بیج میں املی کا پورا درخت
پنہاں ہوتا ہے اسی طرح اس نقطہ میں انسان کی کل عقلی زندگی پنہاں
ہوتی ہے اور اس کی حیات طبعی بھی (اگر ایسا کیا جائے تو) اسی کے تابع
ہوتی ہے۔ اسی نقطہ کے گرد انسان کا فکری دائرہ پیدا ہوتا ہے جو کل
حیات انسانی کو اپنے اندر احاطہ کر کے اس کے گرد گردش کرتا رہتا ہے
انسان کی حیات عقلی کی تعمیر کا یہ فطری طریقہ ہے۔ اس میں تبدیلی کا کوئی
احتمال و امکان نہیں ہوسکتا۔ یہ ناممکن بات ہے کہ اس مرکز میں تبدیلی
کئے بغیر انسان اپنی زندگی کو بالکلیہ بدل دے۔ اسی طرح یہ بھی غیر ممکن ہے
کہ انسانی زندگی کی کوئی نئی تعمیر اس کے مرکز افکار میں تغیر کئے بغیر ہو جائے۔

مرکز افکار کے خواص

افکار انسانی کے نقطۂ مرکزی کی چند خاصیتیں ذکر کر دینا بھی ضروری ہیں۔
اس کی پہلی خاصیت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ماوراء عقل ہوتا ہے یعنی جس
طرح جب کوئی کرہ حرکت کرتا ہے تو اس کے قطبین ساکن رہتے ہیں اسی
طرح اس مرکز میں حرکت فکریہ نہیں ہوسکتی اور یہ ہمیشہ ساکن رہتا ہے اگر
ایسا نہ ہو تو افکار میں کوئی نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ اور کوئی ایسا مقام نہیں
رہتا جس کے ساتھ کل ذہنی حرکات کو مرتبط کر دیا جائے نیز جسکو حکومت کا

نقطہ ابتدا یا نقطہ انتہا مانا جائے البتہ یہ ضروری نہیں ہے کہ جس شے کو بھی افکار کا مرکز بنا رہے ہیں وہ واقعتاً بھی ماوراء عقل ہو لیکن یہ ضروری ہے کہ اس کو انسان ماوراء عقل اور حدود حرکت فکریہ کے باہر مانے خواہ ان کا یہ فرض کرنا قطعاً خلاف واقعہ ہی کیوں نہ ہو۔ مرکز افکار کی یہ خاصیت واقعات سے بھی ثابت ہے یعنی دنیا میں ہر شخص اپنے دائرہ فکریہ کے مرکز کو عقل کے ماوراء سمجھتا ہے۔ جیسا کہ ہماری آئندہ سطور سے معلوم ہوگا۔

اس کی دوسری خاصیت یہ ہے کہ اس کا ارتقاء اور اس کا علو افکار انسانی میں ترقی و بلندی پیدا کرتا ہے اور اس کی پستی افکار کو پست کر دیتی ہے۔ یہ چیز عقلاً و تجربتہً بالکل واضح ہے۔ اس لئے کہ افکار درحقیقت وہ زوایا ہوتے ہیں جو اس نقطہ سے مختلف نسبتوں کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ نقطہ جس قدر اعلیٰ وارفع ہوگا اسی قدر افکار میں علو و ارتقاء پیدا ہوگا اور برعکس صورت میں نتیجہ بھی برعکس ہوگا۔

اس کی تیسری خاصیت یہ ہے کہ یہ اپنے مناسب ماحول پیدا کرتا ہے مثلاً اگر ہم عالم طبعی کی کسی شے کو اپنے افکار کا مرکز بنالیں تو ہماری کل حرکاتِ فکر طبعی مناہج پر ہوں گی اور رفتہ رفتہ ہماری حیات طبعی ہم پر اس درجہ غالب آجائے گی کہ ہماری حیات عقلی پر موت طاری ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر ہم کسی ایسے نقطہ کو افکار کا مرکز بنائیں جو عالم عقلی کا فرد نہ سہی لیکن اس سے مناسبت و تعلق رکھتا ہے تو ہماری حیات عقلی غالب ہو جائے گی اور اس کی قوت و طاقت بڑھ جائے گی۔ مگر اس صورت میں

یہ نہ ہوگا کہ ہماری حیات طبعی بالکل فنا ہو جائے اس لئے کہ حیات عقلی
چونکہ حیات طبعی پر حکومت کرنا چاہتی ہے اس لئے خود اس کا اقتضا
کہ حیات طبعی اپنی حدود میں باقی رکھی جائے۔

اس کی یہ خاصیت بھی بالکل ظاہر ہے اس لئے کہ یہ مرکز افکار کے
لئے بمنزلہ علت کے ہوتا ہے اور علت و معلول میں مناسبت ہونا ضروری
ولابدی ہے۔

اس کی چوتھی خاصیت یہ ہے کہ یہ تحلیل و تجزیہ کے قابل نہیں ہوتا
جس طرح ریاضی کا نقطہ ناقابل تقسیم اور بسیط ہوتا ہے اسی طرح یہ ذہنی
نقطہ بھی ناقابل تقسیم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس میں اجزاء ہوتے ہی نہیں
نیز یہ کہ تجزیہ و تحلیل حرکت فکریہ کو مستلزم ہیں اور وہ اس میں ممکن نہیں ہے

غیر مومنین کی حیات عقلی سے محرومی و بے خبری

اب ہم اس چیز کو واضح کرنا چاہتے ہیں کہ حیات عقلی صرف خدا کے
دین اسلام کے ساتھ خاص ہے اور غیر اسلام میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے
نہ کوئی غیر مسلم اس سے واقف ہے نہ ہو سکتا ہے نہ اس کو یہ زندگی میسر
آسکتی ہے اور نہ اس کو اس کا علم ہی ہو سکتا ہے کہ یہ زندگی کیا چیز ہے
اور اس کو کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔ باوجودیکہ ہر انسان فطرتاً
زندگی کی اس نوعیت کا خواہاں ہے اور انسان و انسانیت کے بقاء
وارتقاء کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کی حیات حیات عقلی ہو، بلکہ

جیسا کہ سابق میں کہا جا چکا ہے انسانیت نام ہی حیات عقلی کا ہے۔
اسلام اسی حیات عقلی کے پیغام سے عبارت ہے اور "اسلامی نظام" اسی زندگی کے نظام کا دوسرا نام ہے۔

غیر مسلمین کی حیات عقلی سے بے خبری مرکز افکار کی تیسری خاصیت کا ظہور ہے۔ اسلام کے علاوہ دنیا کے ہر مذہب میں (یہاں تک کہ لامذہبی کے مذہب میں بھی) اسی عالم طبیعی کی کسی نہ کسی شئے کو مرکز افکار بنایا گیا ہے جو اپنے مناسب ماحول پیدا کرتا ہے اور غیر مسلم کی عقل کو محض طبیعی مناہج پر حرکت دے کر اور حیات عقلی کو (جو فطرتاً ہر شخص میں موجود ہوتی ہے گو ضعیف ہو) قوانین طبعیہ کا پابند و محتاج بنا کر رفتہ رفتہ حیات طبیعی میں تبدیل کر دیتا ہے یہاں تک کہ اس کی حیات عقلی ہلاکت تک پہونچ جاتی ہے اور محض حیات طبیعی کا وجود رہ جاتا ہے جو بالکل حیوانی ہوتی ہے اور جس کو قرآن مجید الحیوۃ الدُنیا کہتا ہے۔

حیات عقلی سے اس بے خبری ہی کا اثر ہے کہ جب ہادی عالم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کا پیغام اور حیات عقلی کا نیا نظام لے کر آئے تو کفار نے صاف طور پر اس طبیعی زندگی کے ماوراء کسی زندگی کے وجود ہی سے انکار کر دیا۔

ان ھی الا حیوتنا الدُنیا نموت و نحیٰ وما نحن بمبعوثین ؕ	بس صرف ہماری دنیا ہی کی زندگی ہے اور ہم (قیامت میں) اٹھائے نہ جائیں گے۔

حیات طبعی کا اس قدر ان پر غلبہ تھا کہ یہ بات ان کے ذہن ہی میں نہ آسکتی تھی کہ الحیوۃ الدنیا کے علاوہ کوئی الحیوۃ الطیبۃ یا الحیوۃ العقلی بھی ہو سکتی ہے۔ ان کو اس پر حیرت ہوتی تھی اور وہ حیرت سے پوچھتے تھے۔

یقولون ائنا لمردودون فی الحافرۃ ءاذا کنا عظاما نخرۃ ؕ

وہ کہتے ہیں کہ کیا ہم الٹے پاؤں پھر آئیں گے۔ کیا اس وقت جب کہ ہم بوسیدہ ہڈیاں ہو جائیں گے۔

حیات عقلی سے بے خبری و جہالت کل غیر اسلامی جماعتوں میں عام ہے۔ یہی نہیں بلکہ کل غیر اسلامی نظریات و مذاہب کا تعلق محض انسان کی حیات طبعی سے ہے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ ہر مذہب نے کسی نہ کسی ایسی شے کو مرکز افکار بنایا ہے جو عالم طبعی سے تعلق رکھتی ہے جس کی علامت یہ ہے کہ وہ اس کو ماوراء عقل فرض کرتے ہیں۔ مثلاً جو لوگ وجود الٰہی کے قائل نہیں ہیں وہ نفس طبیعت (Nature) کو ماوراء عقل فرض کرتے ہیں اور اس کو اپنے کل افکار کا مرکز قرار دیتے ہیں اسی لئے وہ اپنی حیات عقلی[۵] کیلئے طبعی قوانین سے اصول و قوانین اخذ کرتے ہیں اور حیات عقلی کے عمل کے لئے انھیں کو ذریعہ

---

[۵] حیات عقلی کا وجود تو فطرتاً ہر انسان میں ہوتا ہے لیکن جب اس کو کسی طریقہ سے حیات طبعی کے تابع کردیا جاتا ہے تو رفتہ رفتہ وہ ضعیف ہو کر ہلاکت کے درجہ پر پہونچ جاتی ہے ۱۲

بناتے ہیں۔ ان کا دائرہ فکر یہ محض طبعی محور پر گردش کرتا ہے اور عالم طبعی سے ماوراء نہیں جاسکتا۔ یہی نہیں بلکہ طبیعت کو وہ منتہائے فکر سمجھتے ہیں اور اس سے آگے قدم بڑھانے کی کبھی ان کو جرأت نہیں ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے۔

البتہ ان غیر اسلامی مذاہب و نظریات کے متعلق جنھوں نے روحانیت کی بھی تبلیغ کی ہے ذرا یہ شئے بظاہر مخفی معلوم ہوتی ہے کہ وہ بھی انسان کی حیاتِ عقلی سے بے خبر ہیں اور اس کیلئے کوئی نظام (خواہ وہ غلط ہو یا صحیح) پیش نہیں کرتے ہیں۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت وہ بھی اس چیز سے لاعلم ہیں۔ ان کا ذہن یہاں تک تو پہونچا کہ انسان محض حیات طبعی کا حامل نہیں ہے بلکہ اس کو ایک دوسرے نوع کی زندگی بھی حاصل ہے لیکن اس کی صحیح حیثیت اس کا صحیح منہاج عمل اور اس کا نظام یہ سب چیزیں ان سے مخفی رہیں چنانچہ انھوں نے بمقتضائے ع "چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند" اس کو طبعی قوانین کے تابع کر دیا اور انھیں قوانین اور اس کے نظام کو دیکھ کر حیات عقلی کا نظام اور اس کا منہاج عمل متعین کر دیا۔ یہاں تک کہ جب وہ خالص غیر طبعی مرکز افکار کی تعیین اور اس کے تصور سے قاصر رہے تو انھوں نے اس کو ایک فرضی شے قرار دے کر عالم طبعی ہی کی بعض چیزوں کو ماوراء عقل قرار دیا اور انہی کو مرکز افکار قرار دینے کی کوشش کی۔ درحقیقت ان کا رویہ ناقابل فہم اور

ان کی اس ذہنی الجھن اور فکری کشمکش کا آئینہ دار ہے جو ان کو حیات
عقلی کے وجود کے احساس اور اس سے اس کے نظام، منہاج عمل اور
دائرۂ عمل وغیرہ سے مکمل لاعلمی کی وجہ سے عارض ہو گئی ہے۔ ایک
طرف وہ ایک ایسے وجود کے قائل ہیں جو مابعد الطبیعی Meta Physical
ہے اور دوسری طرف اسی وجود اور اسی ہستی کو دیویوں اور دیوتاؤں
کی صورت میں ظاہر کرتے ہیں اور اس سے طبعی آثار کے ظہور کے قائل
ہوتے ہیں دراصل اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ کسی خالص عقلی مرکز افکار
کا تصور نہیں کر سکتے اور کسی ایسے مرکز افکار کو وہ سمجھ ہی نہیں سکتے
تھے جو کسی خالص مابعد الطبیعی ہستی کا تصور قرار دیا جا سکے۔ اہل ہنود
کے خرافات اس کی مکمل نظیر ہیں۔ بنو اسرائیل نے بھی اپنی اسی ذہنی
کمزوری کی بنا پر کہا تھا۔

اجعل لنا الٰھاً کما
لھم اٰلھۃ ط

ہمارے لئے بھی ایک الٰہ ایسا بناؤ جیسے
ان لوگوں (بت پرستوں کے) الٰہ ہیں۔

اس کشمکش سے نجات حاصل کرنے کے لئے مندرجہ بالا نوع کے
مذاہب نے ایک اور راستہ بھی اختیار کیا ہے اور وہ یہ کہ انھوں نے
حیات عقلی اور حیات طبعی میں بالکلیہ انقطاع کر کے دونوں کے دائرہ ہائے
عمل کو الگ الگ کر دیا۔ اور روحانی جماعتوں کو مادی جماعتوں سے
بالکل جدا کر دیا لیکن خالص حیات طبعی بسر کرنے والوں کے اجتماع سے
جو ماحول پیدا ہو سکتا ہے اس میں یہ صلاحیت کہاں سے آ سکتی ہے کہ

وہ ایسے افراد بھی پیدا کرے جو خالص روحانی زندگی کی طرف جا سکیں اور خالص حیات عقلی بسر کر سکیں۔ اس لئے نتیجہ یہ ہوا کہ روحانیت تو رفتہ رفتہ سب سے مفقود ہو گئی اور خالص حیوانی زندگی عام طور پر پھیل گئی۔ پھر یہ محض ماحول ہی کا اثر نہ تھا بلکہ اس میں اس چیز کو بھی دخل تھا کہ انھوں نے حیات عقلی سے مناسبت رکھنے والے نظام سے بے خبری کے باعث اس کے لئے ایسا نظام تجویز کیا جو طبعی قوانین سے ہی ماخوذ تھا۔ طبعی زندگی اور عقلی زندگی میں ان کو تضاد نظر آتا تھا اس لئے حیات عقلی کے غلبہ کی کوئی صورت اس کے سوا ان کے نزدیک نہیں ہو سکتی تھی کہ حیات طبعی کو ضعیف یا ہلاک کر دیا جائے۔ اس مسئلہ میں صاف طور پر یہ نظر آتا ہے کہ تنازع للبقاء (Struggle for Existence) کا اصول ان کی رہنمائی کر رہا تھا جو قطعی طور پر خالص طبعی اصول ہے مہلک مشقتیں اور ریاضتیں، تجرد و رہبانیت، یہ سب چیزیں مندرجہ بالا اصول ہی کے تحت میں داخل ہیں۔ اسی طرح حیات طبعی کے وجود کی صرف یہ صورت ان کی نظر میں تھی کہ حیات عقلی سے بالکل آنکھیں بند کر لی جائیں۔

اسلام کے علاوہ دنیا کے کل مذاہب و نظریات کا یہی حال ہے کہ وہ انسان کی حیات عقلی اور اس کے اصلی اقتضاآت سے قطعاً نابلد ہیں اور اس کے لئے کسی نظام اور منہاج عمل کے پیش کرنے سے قطعاً قاصر ہیں بلکہ وہ صحیح طور پر یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ حیات عقلی اور حیات طبعی میں

ان کی اس ذہنی الجھن اور فکری کشمکش کا آئینہ دار ہے جو ان کو حیات حا
عقلی کے وجود کے احساس اور اس سے اس کے نظام منہاج عمل اور
دائرہ عمل وغیرہ سے مکمل لاعلمی کی وجہ سے عارض ہو گئی ہے۔ ایک
طرف وہ ایک ایسے وجود کے قائل ہیں جو مابعد الطبیعی Meta Physical
ہے اور دوسری طرف اسی وجود اور اسی ہستی کو دیویوں اور دیوتاؤں
کی صورت میں ظاہر کرتے ہیں اور اس سے طبعی آثار کے ظہور کے قائل
ہوتے ہیں دراصل اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ کسی خالص عقلی مرکز افکار
کا تصور نہیں کر سکتے اور کسی ایسے مرکز افکار کو وہ سمجھ ہی نہیں سکتے
تھے جو کسی خالص مابعد الطبیعی ہستی کا تصور قرار دیا جا سکے۔ اہل ہنود
کے خرافات اس کی مکمل نظیر ہیں۔ بنو اسرائیل نے بھی اپنی اسی ذہنی
کمزوری کی بناء پر کہا تھا۔

اجعل لنا الٰھاً کما لھم اٰلھۃ ؕ — ہمارے لئے بھی ایک الٰہ ایسا بناؤ جیسے ان لوگوں (بت پرستوں کے) الٰہ ہیں۔

اس کشمکش سے نجات حاصل کرنے کے لئے مندرجہ بالا نوع کے
مذاہب نے ایک اور راستہ بھی اختیار کیا ہے اور وہ یہ کہ انھوں نے
حیات عقلی اور حیات طبعی میں بالکلیہ انقطاع کر کے دونوں کے دائرہ ہائے
عمل کو الگ الگ کر دیا۔ اور روحانی جماعتوں کو مادی جماعتوں سے
بالکل جدا کر دیا لیکن خالص حیات طبعی بسر کرنے والوں کے اجتماع سے
جو ماحول پیدا ہو سکتا ہے اس میں یہ صلاحیت کہاں سے آسکتی ہے کہ

وہ ایسے افراد بھی پیدا کرے جو خالص روحانی زندگی کی طرف جا سکیں اور خالص حیات عقلی بسر کر سکیں۔ اس لئے نتیجہ یہ ہوا کہ روحانیت تو رفتہ رفتہ سب سے مفقود ہو گئی اور خالص حیوانی زندگی عام طور پر پھیل گئی۔ پھر یہ محض ماحول ہی کا اثر نہ تھا بلکہ اس میں اس چیز کو بھی دخل تھا کہ انھوں نے حیات عقلی سے مناسبت رکھنے والے نظام سے بے خبری کے باعث اس کے لئے ایسا نظام تجویز کیا جو طبعی قوانین سے ہی ماخوذ تھا۔ طبعی زندگی اور عقلی زندگی میں ان کو تضاد نظر آتا تھا اس لئے حیات عقلی کے غلبہ کی کوئی صورت اس کے سوا ان کے نزدیک نہیں ہو سکتی تھی کہ حیات طبعی کو ضعیف یا ہلاک کر دیا جائے۔ اس مسئلہ میں صاف طور پر یہ نظر آتا ہے کہ تنازع للبقاء (Struggle for Existence) کا اصول ان کی رہنمائی کر رہا تھا جو قطعی طور پر خالص طبعی اصول ہے مہلک مشقتیں اور ریاضتیں، تجرد و رہبانیت، یہ سب چیزیں مندرجہ بالا اصول ہی کے تحت میں داخل ہیں۔ اسی طرح حیات طبعی کے وجود کی صرف یہ صورت ان کی نظر میں تھی کہ حیات عقلی سے بالکل آنکھیں بند کر لی جائیں۔

اسلام کے علاوہ دنیا کے کل مذاہب و نظریات کا یہی حال ہے کہ وہ انسان کی حیات عقلی اور اس کے اصلی اقتضاآت سے قطعاً نابلد ہیں اور اس کے لئے کسی نظام اور منہاج عمل کے پیش کرنے سے قطعاً قاصر ہیں بلکہ وہ صحیح طور پر یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ حیات عقلی اور حیات طبعی میں

کیا ربط اور تعلق ہے۔ درحقیقت اس مسئلہ کو صرف انبیاء علیہم السلام کی وحی ہی صحیح طور پر حل کر سکتی ہے اور اس لئے صرف وہی امت اس بارہ میں راہ راست پر ہو سکتی ہے جس نے انبیاء کی تعلیم اور ان کے پیغام پر اپنے افکار کی بنیاد رکھی ہو۔

ہم اپنے اس دعوے کو دوسرے الفاظ میں یوں ذکر کر سکتے ہیں کہ اسلام کے علاوہ دنیا میں جس قدر نظام حیات پیش کئے گئے ہیں یا پیش کئے جا سکتے ہیں ان سب کی بنیاد اس مفروضہ پر قایم ہے کہ انسان ایک حیوان ہے۔ یہ فخر صرف اسلام کو حاصل ہے کہ اس کی ابتدا اسی حقیقت سے ہوتی ہے کہ انسان انسان ہے نہ کہ حیوان' غرض صرف اسلام ہی وہ نظام حیات ہے جو حیات عقلی سے دنیا کو روشناس کراتا ہے اور اس کا منہاج عمل نیز اس کا حیات طبعی کے ساتھ ربط و تعلق واضح کرتا ہے اور اس طرح انسان کو ارتقاء و عروج کی ان منازل کی طرف لیجاتا ہے جس کا تصور بھی غیر اسلامی اصول میں نہیں ہو سکتا۔

واضح رہے کہ اس ساری بحث میں "اسلام" سے ہماری مراد تمام انبیاء علیہم السلام کا مشترکہ پیغام ہے جو اپنی بنیاد اور اصولوں کے لحاظ سے ایک ہی ہے۔ البتہ مختلف زمانوں اور مختلف قوموں کے مصالح کے لحاظ سے فروعی احکام اور شرائع میں وقتاً فوقتاً ترمیم و تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔

حیاتِ عقلی کی جانب قرآن حکیم کے اشارات

انسانی حیات کا وہ مکمل اور اعلیٰ تصوّر جس کو حیات عقلی کے لفظ[1] سے ہم نے تعبیر کیا ہے نہ صرف یہ کہ اسلام اس کو پیش کرتا ہے بلکہ اسلام اسی کے نظام اور اسی کی تشریح سے عبارت ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:۔

اومن کان میتاً فاحییناہ وجعلنا لہٗ نوراً یمشی بہٖ فی الناس کمن مثلہٗ فی الظلمات لیس بخارجٍ منہا	جو شخص پہلے مردہ تھا اس کو ہم نے حیات بخشی (حیات عقلی) اور ہم نے اس کو ایسی روشنی دی (مرکز نظام حیات عقلی = ایمان) کہ وہ اس کو لئے ہوئے لوگوں میں چلتا پھرتا ہے

کیا ایسا شخص اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس کا حال یہ ہو کہ وہ تاریکیوں میں ہے اور اس سے نکلنے نہیں پاتا (یعنی حیات عقلی سے محروم ہے اور محض حیات طبعی بسر کر رہا ہے)

---

[1] لفظ "حیات عقلی" میری اصطلاح ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ اصطلاح قرآن مجید میں مل جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ اس کا جو مفہوم میں نے بیان کیا ہے اس کی جانب ان آیات میں صاف اشارہ موجود ہے زیادہ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی مدظلہ کی کتاب "حیوٰۃ المسلمین" کا دیباچہ ۱۲

دوسری جگہ اسی نعمت کو اطاعت رسول کا موجب قرار دیا گیا ہے:-

یا ایہا الذین اٰمنوا استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم ؏ اے اہل ایمان اللہ اور اس کے رسول کے حکم کو بجا لاؤ جب وہ تم کو بلائیں کیوں کہ وہ تم کو زندگی (حیاتِ عقلی) بخشتے ہیں (یا جبکہ وہ تم کو ایسی چیزوں کی طرف بلائیں جو تمہارے لئے زندگی بخش ہیں)

قرآن مجید سے کفار کی ایک جماعت کیوں فائدہ نہیں اٹھا سکتی؟ اس لئے کہ وہ حیات عقلی سے کلیتہً محروم ہو چکی ہے اور اس کی زندگی خالصتہً طبعی بن چکی ہے۔ لہٰذا اب اس کے لئے انذار و تخویف بے سود ہے۔ اور وہ ختم اللہ علی قلوبہم میں داخل ہو چکی ہے۔

ان ہو الا ذکر و قراٰن مبین لینذر من کان حیّاً و یحق القول علی الکافرین ؏ یہ تو محض یاد دہانی اور بیان کرنیوالا قرآن ہے تاکہ اس شخص کو ڈرائے (اللہ سے) جو زندہ ہو حیات عقلی[۵] کا کوئی شائبہ رکھتا ہو) اور کافروں پر بات پوری ہو جائے۔

---

[۵] - ہدایت و اضلال کا یہی مفہوم ہے۔ ہدایت سے فائدہ صرف وہی شخص اٹھا سکتا ہے جس میں حیات عقلی کا کوئی شائبہ موجود ہو لیکن جو شخص اپنی زندگی کو کلیتہً مسخ کر چکا ہو اور اپنی حیات عقلی کو ہلاک کر کے خود کو کلیتہً طبعی قوانین کے سپرد کر چکا ہو وہ طبعی طور پر اضطرار کی حد پر پہونچ جاتا ہے گو عقلاً مضطر

[illegible] 21/10/80

حیات عقلی کے خواص

مجھے یقین ہے کہ میں "حیات عقلی" اور "حیات طبعی" کے مفہوموں کو کافی طریقہ سے واضح کر چکا ہوں اب سطور ذیل میں میں انسانی زندگی کی دونوں قسموں کے خواص و اثرات کو الگ الگ بیان کرنا چاہتا ہوں تاکہ دیکھنے والے خود فیصلہ کر سکیں کہ ان کو کونسی زندگی اختیار کرنا چاہئے اور زندگی کی کونسی قسم انسانیت سے مناسبت رکھتی ہے اور صحیح معنی میں انسانی زندگی کہی جا سکتی ہے۔

راحت و اطمینان

انسان فطری طور پر راحت و اطمینان کا جویا ہے۔ اس کے ہر فعل کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ راحت و سکون قلب حاصل کرے اور یہ اسی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔) نہیں ہوتا ختم قلب اسی درجہ سے عبارت ہے طبعی قوانین کا عمل ہم پر ہمارے اختیار سے نہیں ہوتا وہ جس چیز پر بھی عمل کرتے ہیں اس کو مجبور بنا دیتے ہیں۔ عقل کو ان کی زد سے بچانا ممکن ہے مگر جب کوئی شخص اپنے اختیار سے اپنی عقل بھی ان کے سپرد کر دے تو اس کا عقلی اختیار بھی طبعی قوانین کے تابع ہو جاتا ہے اور وہ جلوۂ ثانیہ حاصل کرنے پر بالکلیہ تو نہیں لیکن بڑی حد تک اپنی قدرت کھو بیٹھتا ہے۔

صورت میں ممکن ہے جب وہ "عقلی زندگی" بسر کرے یعنی اس کی زندگی ان اصول و قوانین کی پابند ہو جو اس کی عقل کو اپیل کرتے ہیں اور وہ محض طبعی اصول کے تابع نہ ہو۔ بلکہ اس کی عقل اس کی طبیعت پر حاکم ہو۔ اس لئے کہ محض طبعی قوانین انسان کے فائدہ و ضرر کو متعین نہیں کر سکتے اور نہ خیر و شر کی کوئی تعین کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں یہ یقینی ہے کہ انسان اپنے نفس اور اپنی طبیعت کے مقتضا پر عمل کر کے نقصان، تکلیف اور پریشانی اٹھائے جیسا کہ پچھلے صفحات میں واضح کیا جا چکا ہے، اس کے خلاف "عقلی زندگی" کے کل اصول فائدہ اور خیر کے گرد گردش کرتے ہیں اس لئے ان پر عمل کر کے انسان یقیناً فائدہ اٹھائے گا اور ضرر سے محفوظ رہے گا جس کا لازمی نتیجہ راحت و اطمینان ہے۔

دوام و بقا

پھر عقلی زندگی سے صرف راحت ہی نہیں حاصل ہوتی ہے بلکہ یہ راحت دائمی بھی ہوتی ہے اس لئے کہ خود عقلی زندگی دائمی ہے۔ طبعی زندگی چونکہ طبعی قوانین کے تابع ہوتی ہے اور طبعی قوانین آپس میں متضاد و متناقض ہیں اس لئے ان کے اثرات بھی باہم متناقض و متضاد ہوتے ہیں حتیٰ کہ بسا اوقات ایک کا وجود دوسرے کے عدم کو مستلزم ہوتا ہے اور ان کے اسی تضاد و تناقض پر عالم طبعی کا یہ کارخانہ قائم ہے

بچہ کی پیدایش باپ کے جوہر جسم سے اور اس کی پرورش ماں کا خون چوس کر ہوتی ہے۔ سیکڑوں چھوٹے چھوٹے کیڑوں کی موت ایک مچھلی کی زندگی کا باعث بنتی ہے اور ہر درخت اپنی قوت حیات کو ضعیف بلکہ بعض اوقات مٹا کر دوسرے درختوں کے وجود کا سبب بنتا ہے۔ یہ سب طبعی قوانین کے ماتحت ہی ہوتا رہتا ہے۔ جن کے تحت رہنے والی ہر شے کے لئے فنا لازم ہے۔ اس لئے طبعی زندگی بھی یقینی طور پر فانی ہے اور طبعی راحت بھی یقینی فانی ہے اس لئے کہ وہ طبعی قوتیں اور آلات جن سے انسان طبعی راحت حاصل کرتا ہے وہ خود فانی ہیں نیز متضاد عوامل کی کشمکش میں گرفتار ہیں۔ اس لئے ان کے لئے راحت ایک لفظ بے معنی ہے۔ مگر عقلی زندگی اس سے بالکل مختلف ہے۔ اس کے اصول و عوامل میں نہ تضاد ہے نہ تناقض وہ باہم ایک دوسرے کے ساتھ منطقی ربط رکھتے ہیں اس لئے ہر ایک کا وجود سب کے وجود کو مستلزم ہے لہٰذا وہ دائمی ہیں اور ان کے اس دوام نے پوری عقلی زندگی کو یقینی دوام و بقا کا خلعت پہنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عقلی راحت و اطمینان بھی ـــــ دائمی و ابدی ہیں۔ اور ان کو فنا نہیں بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جس چیز کو ہماری عقلی حیات پیدا کرتی ہے وہ بھی دائمی و ابدی ہوتی ہے۔

علمی و عقلی ترقی

عقلی زندگی کا دوسرا خاصہ علمی و عقلی ترقی کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے جو بالکل ظاہر ہے۔ عقلی زندگی کے معنی ہی یہ ہیں کہ عقل کو طبیعت پر

غالب کر دیا گیا ہے۔ جس کا نتیجہ عقل کے روز افزوں ارتقا اور نشو و نما کی صورت میں نکلنا بالکل بدیہی اور لابدی ہے۔ پھر اس ارتقا کی انتہا وہیں ہو سکتی ہے، جہاں عقل خود سپر ڈال دیتی ہے یعنی جو اشیاء واقعتاً ماوراء عقل ہیں ان میں غور و خوض کرنے سے خود عقل انسانی اِبا کرتی ہے لیکن اس سے پہلے اِس ترقی کی رفتار میں کوئی سستی بھی پیدا نہیں ہو سکتی چہ جائیکہ سکون پیدا ہو۔ طبعی زندگی میں انسان مجبور ہوتا ہے کہ عالم طبعی ہی کی کسی شے کو منتہائے فکر بنائے۔ اور اس کی عقل اور اس کا علم اس سے آگے قدم بڑھانے سے قطعاً معذور و مجبور ہو جاتے ہیں اس لئے کہ وہی شے اس کی فکر کا مرکز ہوتی ہے اس لئے خود اس میں یا اس کے آگے حرکت فکریہ کا ہونا محال ہے جیسا کہ سابق سطور میں بیان ہو چکا ہے۔ بخلاف ازیں عقلی زندگی کا مرکز کسی طبعی شے کو بنایا ہی نہیں جا سکتا اس لئے ایسی زندگی میں "انسانی عقل" کل عالم طبعی کی سیر یکساں رفتار کے ساتھ کرتی ہے اور اس کا علم کل کائنات کے احاطے کی کوشش کرتا ہے، اور اس کی ترقی طبعی زندگی کی طرح عالم طبعی ہی کے بعض مظاہر تک محدود ہو کر نہیں رہ جاتی۔ عقلی زندگی بسر کرنے والا انسان کائنات کو ایک ایسے مقام سے کھڑے ہو کر دیکھتا ہے جہاں سے اس کی نظر ایک معنی گر کل کائنات کو محیط ہو سکتی ہے۔ بخلاف اس کے "طبعی زندگی" رکھنے والا انسان ایک ایسے پست مقام پر کھڑے ہو کر کائنات پر نظر کرتا ہے جہاں سے کائنات کے ایک بہت بڑے حصے کا اس کی نظر سے مخفی رہ جانا لازمی ہے۔

تمدنی ترقی

وہ تمدن جو محض حیوانی جذبات اور خواہشوں پر قائم ہو اس کی ترقی محدود اور اس کے زوال کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہے اس لئے کہ جذبات خود متضاد و متخالف ہیں۔ نہ ان کو قیام و قرار ہوتا ہے۔ اور نہ ان میں وہ فطری ربط و تعلق پایا جاتا ہے جو کسی نظام تمدن کی بقا کا ضامن ہو سکے یا اس کو غیر محدود ترقی دے سکے۔ طبعی بنیادوں پر جس مدنیت کی تعمیر ہوتی ہے وہ بالکل اسی طرح کی ہوتی ہے جس طرح وقتی ضروریات و میلانات کے ماتحت حیوانات کے جوڑے بن جاتے ہیں یا گلے وجود میں آجاتے ہیں جن میں حقیقی طور پر کوئی ایسا تعلق اور رابطہ نہیں ہوتا جو ان کو متحد رکھ سکے اور ان کے اس اجتماع کو خلعت دوام عطا کر سکے۔ نیز یہ "طبعی تمدن" ترقی معکوس کرتا ہے۔ یعنی انسان کو رفتہ رفتہ انسانیت سے حیوانیت اور اجتماعیت سے انفرادیت کی جانب لے جاتا ہے۔ پھر یہی انفرادیت انسانیت کی موت اور مدنیت کی تباہی تک پہنچا دیتی ہے ——— لیکن عقلی اصولوں پر مبنی مدنیت اس کے بالکل برعکس صفات رکھتی ہے۔ وہ روز افزوں ترقی کرتی ہے اس لئے کہ اس کو وجود میں لانے والے اصول ایک دوسرے سے مربوط اور تضاد و تخالف سے پاک ہوتے ہیں وہ ایک انسان کے جذبات کو دوسرے انسانوں کے جذبات سے ملا دینے کی بے سود کوشش نہیں کرتے ہیں بلکہ وہ ہر انسان کی عقل کو دوسرے انسان کی عقل سے

متصل کر کے ان میں ایک عقلی وحدت و یگانگت پیدا کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے جذبات و میلانات میں خود بخود ایک نوع کی وحدت و یک رنگی کا وجود ہو جاتا ہے۔ پھر چونکہ عقلی انسان غیر محدود طور پر ترقی پذیر ہے اس لئے یہ تمدن بھی غیر محدود ترقی کرتا رہتا ہے اور اس پر فنا نہیں طاری ہوتی۔

مجملاً یہ چند خواص حیات عقلی کے ذکر کر دئے گئے جن میں جامعیت کی شان پائی جاتی ہے اور جن کے ماتحت سیکڑوں دوسری خاصیتیں آ جاتی ہیں۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ "عقلی زندگی" کے برکات انہیں میں محدود ہیں۔ بلکہ اس کے برکات کا دائرہ اس سے بہت زیادہ وسیع ہے یہ جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے وہ "مشتے نمونہ از خروارے" کا مصداق ہے۔

حیات طبعی کے خواص

حیات طبعی کے خواص کا اندازہ بھی حیات عقلی کے مذکورہ بالا خواص پر نظر کرنے سے ہی ہو سکتا ہے۔ "طبعی زندگی" حیوانی زندگی ہوتی ہے۔ اس میں انسانیت کیلئے گنجائش نکالنا ناممکن ہے اس لئے اس میں راحت و اطمینان اور دوام و بقا کا تلاش کرنا بے سود ہے۔ اس میں عقلی ترقی بھی طبعی منہاج پر ہوتی ہے اس لئے وہ محدود ہوتی ہے اور پھر غیر اختیاری بھی ہوتی ہے یعنی یہ چیز انسان کے اختیار میں نہیں رہتی کہ وہ اپنے علم و عقل کے دائرہ کو جس قدر چاہے وسیع کر سکے بلکہ ایک محدود مسافت وہ طے

کر سکتا ہے اور ایک حد معین پر جا کر مجبور ہو جاتا ہے کہ اپنی علمی و عقلی ترقی کو روک دے۔ یعنی خود بخود اس کی عقل اور اس کا علم ایک حد پر جا کر رک جاتے ہیں اور یہ حد عالم طبعی ہی کا کوئی مظہر ہوتی ہے۔

اس حیوانی زندگی میں عجیب و غریب چیزیں ظہور پذیر ہوتی رہیں۔ یہ زندگی وقتی لذت سے پر ہوتی ہے مگر اس میں راحت و اطمینان کا نام و نشان بھی نہیں ہوتا۔ خواہشوں کا بے پناہ سیلاب جو قومی تمدن کے بند کو بھی توڑ دیتا ہے اس کا خاصہ لازمہ ہے جس کا اثر ایک عجیب روحانی و نفسانی دائمی بے چینی و بے اطمینانی کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے جو بالآخر انسان کو ایک قسم کے جنون میں مبتلا کر دیتا ہے۔ پھر اس قسم کے مجنون چند ہی دنوں میں تمدن و اجتماع کے رشتوں کو توڑ کر رکھ دیتے ہیں اور عمران و مدنیت کو فنا کے گھاٹ اتار کر خود بھی فنا ہو جاتے ہیں۔

یہاں تک حیات عقلی اور حیات طبعی دونوں کے خواص اجمالی طور پر بیان کئے جا چکے ان کی مثالیں آگے چل کر مناسب موقع پر آئیں گی۔ جن سے یہ معلوم ہوگا کہ ان دونوں کے یہ خواص محض عقلی دلائل سے ہی نہیں دریافت کئے گئے ہیں بلکہ تجربہ اور مشاہدہ بھی ان کی تائید کر رہا ہے۔ اور یہ محض موہوم "امیدیں" یا قوت واہمہ کے پیدا کئے ہوئے "اندیشے" ہی نہیں ہیں بلکہ "واقعات" ہیں جو استقراء کی معمولی کوشش سے معلوم ہو سکتے ہیں۔

(انسانی زندگی کی ان دو قسموں اور ان کے خواص کا تذکرہ

کرنے کے بعد اب میں ہر اس شخص سے جو ذرا بھی عقل رکھتا ہے (خواہ وہ کسی مذہب کا پیرو ہو) یہ سوال کرتا ہوں کہ اس کو ان دونوں زندگیوں میں سے کونسی زندگی پسند ہے؟ اور وہ کس زندگی کو بنی نوع انسان کے لئے مفید اور قابل اختیار سمجھتا ہے؟

مجھے یقین اور کامل یقین ہے کہ ہر وہ شخص جو جذبات سے بالاتر ہو کر محض عقل سے اس سوال پر غور کرے گا اس کا فیصلہ "حیات عقلی" ہی کے حق میں ہو گا اور وہ عقلی زندگی ہی کو اپنے اور جمیع بنی نوع انسان کے لئے منتخب کرے گا۔

عقلی زندگی کس طرح میسر ہو سکتی ہے

اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ عقلی زندگی کس طرح میسر ہو سکتی ہے؟ اس سوال کے مختلف عنوانات ہو سکتے ہیں مثلاً ہم عالم طبعی کے اثرات اور قوانین طبعی کے عمل سے کس طرح اپنی عقل کو آزاد کر سکتے ہیں؟ یا ہم اپنی عقل کو اپنی طبیعت پر کس طرح غالب کر سکتے ہیں؟ یا مثلاً ہم اپنی زندگی طبعی جذبات وخواہشات کے بجائے عقلی اصول وقوانین کے مطابق کس طرح بسر کر سکتے ہیں؟ یہی مختلف عنوانات سوال کی مزید وضاحت بھی کرتے ہیں۔ رہا جواب تو وہ مختصر الفاظ میں یہ اور صرف یہی ہے کہ یہ صورت اسلامی اصول و احکام پر عمل کرنے سے ممکن ہے۔ اس لئے کہ اسلام نام ہی عقلی زندگی کا ہے ایسی منظم "عقلی حیات" کا جو فرد و اجتماع دونوں کو حاوی ہے۔

اسلامی مرکز افکار

ہم یہ ثابت کر چکے ہیں کہ دنیا میں ابتدائے آفرینش سے اب تک زندگی کے جتنے نظرئے پیش کئے گئے اور جتنے نظام انسان کے سامنے لائے گئے بلکہ آئندہ بھی جتنے نئے نظرئے قیامت تک ایجاد کئے جائیں گے وہ سب کے سب انسان کی "حیات طبعی" سے تعلق رکھتے ہیں اور رکھنے والے ہوں گے۔ اس کلیہ سے صرف اسلام کا نظریہ حیات ہی مستثنیٰ ہے۔ اس لئے کہ وہ انسان کو ایک نئی زندگی سے روشناس کراتا ہے جس کا نام "عقلی زندگی" ہے اور جو حقیقی معنی میں انسانی زندگی کہی جا سکتی ہے۔

ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ ہر زندگی کے لئے (خواہ وہ عقلی ہو یا طبعی) منظم ہونا ضروری ہے اور ہر نظام ایک مرکز کا مقتضی ہے۔ اس لئے اسلامی زندگی یا عقلی زندگی کے لئے بھی ایک مرکز کی ضرورت ہے۔ پھر چونکہ انسان کی خارجی زندگی اس کی فکری زندگی کے مظاہر عمل ہی کا نام ہے۔ اس لئے یہ مرکز اولاً تو اس کے افکار ہی کا مرکز ہوگا اور اس کے بعد پھر وہی زندگی کا مرکز و محور بھی بن جائے گا۔

اب فطرتاً اصلی سوال یہ ہو جاتا ہے کہ اسلام نے انسانی افکار کا مرکز کیا قرار دیا ہے؟ بس اس سوال کا حل ہمارے اس دعوے کا ثبوت اپنے اندر لئے ہوئے ہے کہ "اسلام اور صرف اسلام ہی نے دنیا کو عقلی زندگی سے روشناس کرایا ہے" اور وہی عالم انسانیت کو اس حقیقی زندگی

اور حیات طیبہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اس کے بعد یہ چیز بہت آسانی کے ساتھ سمجھ میں آجائے گی کہ یہ اسلامی مرکز حیات کس قدر گہرے اور انقلاب آفریں اثرات عالم انسانیت پر کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ حقیقی طور پر اس کو مرکز حیات بنا لیا جائے۔

اسلام نے ایک ایسی ہستی کے تصور کو افکار بلکہ حیات انسانی کا مرکز قرار دیا ہے جو عالم و عالمیات سے بلند و برتر ہے اور جو عقل و عقلیات سے اوراء ہے، جو ہر لحاظ سے واحد اور احد ہے، ہر کمال سے متصف اور ہر نقصان و عیب سے پاک ہے۔ یہ ہستی اللہ تعالیٰ کی ہستی اور یہ تصور حق تعالیٰ کا صحیح تصور ہے جس کا مشہور عنوان "توحید" ہے۔

پھر ظاہر ہے کہ اس تصور کو انسانی طبیعت کے بجائے انسانی عقل کے ساتھ ایک گونہ مناسبت حاصل ہے کیونکہ جس ہستی کا یہ تصور ہے وہ عالم طبعی کی کوئی شئے نہیں ہے نہ سلسلہ طبعیات کی کوئی کڑی ہے نہ اس کی معرفت طبعی طریقوں سے ممکن۔ البتہ عقل سے اس کی معرفت کسی درجہ میں ممکن ہے گو اس کا پورا ادراک اور اس کی حقیقت کا علم عقل سے بھی ناممکن ہے (اور ناممکن ہونا بھی چاہیئے کیونکہ مرکز افکار ماوراء افکار ہوتا ہی ہے جیسا کہ سابق میں عرض کیا جا چکا ہے) تاہم عقل کے لئے اس کی ایک گونہ اور فی الجملہ معرفت کا امکان ہی اس کے ساتھ ایک ادنیٰ سی مناسبت کا ضرور پتہ دیتا ہے ؎

کجا غفلت نسبتے بہ تو حاصل شود مرا   بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

بنابریں اس ہستی کے تصور کو اپنے افکار کا مرکز بنانے کا یہ اثر یقینی و لابدی ہے کہ انسان عقلی زندگی کی نعمت عظمیٰ حاصل کرے اور حیوانیت کے پست و ذلیل مرتبہ سے ترقی کر کے انسانیت کے مرتبہ اعلیٰ پر فائز ہو جائے۔

گزشتہ صفحات میں ہم مرکز افکار کے خواص کا تذکرہ کر آئے ہیں۔ اس ذیل میں ہم نے واضح کر دیا تھا کہ ہر مرکز اپنے مناسب تصورات پیدا کرتا ہے پھر انھیں تصورات کا عکس اور ظل ہماری زندگی کے خارجی مظاہر ہوتے ہیں۔ توحید الٰہی بھی اسی عام قانون کے مطابق اپنے مناسب تصورات کو جمع کرتی ہے اور اس کے بعد پوری زندگی کو اپنے رنگ میں رنگ دیتی ہے۔ یہاں تک کہ موحدِ کامل کی ہر حرکت و سکون میں توحید کا رنگ پوری آب و تاب سے نمایاں ہوتا ہے اسی کا نام قرآنی اصطلاح میں "صبغۃ اللہ" ہے۔ "ومن احسن من اللہ صبغۃ ونحن لہٗ عابدون"۔

پھر یہ امر بھی واضح کیا جا چکا ہے کہ "حیات عقلی" قوانین کو اپنا آلہ بنا کر عمل کرتی ہے یہی قوانین اس میں نشو و نما اور قوت و ترقی پیدا کرتے ہیں۔ حیات طبعی کا منہاج عمل بھی یہی ہے اور فرق دونوں میں صرف ان قوانین کی نوعیت اور ان کے ماخذوں کے لحاظ سے ہوتا ہے "حیات عقلی" کے حامل انسان کو یہ قوانین دوسرے سرچشمہ سے ملتے ہیں اور حیات طبعی رکھنے والا انسان قوانین کہیں اور سے اخذ کرتا ہے اس لئے "توحید حقیقی" انسان کے علم کے ماخذ اور اس کے سرچشموں میں ایک خصوصیت اور وسعت پیدا کر دیتی ہے۔ اور اس کو علم کے ایسے ذرائع عطا کرتی ہے جو اس کے

علم میں وسعت بھی پیدا کر دیتے ہیں اور رفعت بھی۔

توحید کے لوازم

توحید وہ جنس گراں مایہ اور نعمت عظمیٰ ہے جس کی عظمت کا اعتراف دنیا کے ہر مذہب کو ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا کا ہر وہ مذہب جو خدا کے وجود کا اقرار کرتا ہے وہ توحید کا بھی مدعی ہے لیکن حق یہ ہے کہ سوا اسلام کے توحید حقیقی کا وجود کسی مذہب میں بھی نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تصورات کی مختلف انواع تک عقل کی رسائی کے لئے مختلف طرز ہائے فکر اور مختلف طریق حرکت کی حاجت ہوتی ہے۔ محسوسات میں اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں اگر ہم کسی بلندی پر چڑھنا چاہیں تو ہماری رفتار کا طرز و طریق اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے جو ہم کسی بلندی سے پستی کی جانب اترنے میں یا کسی مستوی السطح زمین پر چلنے میں اختیار کرتے ہیں۔ اگر ہم اول الذکر حالت میں ثانی الذکر حالت کا طریقہ اختیار کریں تو ہمارا منزل مقصود تک پہونچنا ناممکن ہے۔ اسی طرح منزل توحید تک پہنچنے کے لئے جو ایک مابعد الطبعیی META PHYISICAL منزل ہے اور جس کی نوعیت ان سب تصورات سے قطعی طور پر جداگانہ ہے جو عام طور پر عقل انسانی کی دسترس کے اندر ہیں ایک خاص طریق حرکت اور مخصوص طرز فکر کی احتیاج ہوگی۔ ہر انسان کی عقل اس خاص طرز فکر سے آشنا نہیں ورنہ توحید کی تشریح میں عقلا کے درمیان کوئی اختلاف موجود نہ ہوتا۔ اس اختلاف کو دور کرنے اور کسی صحیح اور آخری

نتیجہ پر پہونچنے کے لئے ہم کو ایک آخری حکم FINAL-AUTHORITY کی احتیاج ہے۔ یہیں سے رسالت اور کتاب الہی کا تصور فطرتاً پیدا ہوتا ہے توحید کا عقیدہ ذہن میں قائم کرنے کے بعد ہم فطری طور پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ اس ذات کی طرف سے جس کے متعلق یہ تصور ہے ہم اس کی علمی و عملی تشریح کے منتظر بھی رہیں۔ اس کی علمی تشریح کرنے والی شئے کتاب الہی ہوتی ہے اور عملی تشریح رسول الہی کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ پھر یہ بات مشاہدہ سے ثابت ہے کہ ان دونوں کاموں کو قرآن مجید اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکمل طور پر انجام دیا ہے اور توحید کی ایسی واضح اور مکمل تشریح کی ہے جس کی نظیر مفقود ہے۔

اس سے صاف طور پر واضح ہوا کہ رسالت اور نزول کتاب کا تصور توحید کے لوازم غیر منفکہ میں سے ہے۔ جو اس سے کبھی جدا نہیں ہو سکتا۔ یہی نہیں بلکہ بعثت محمدیہ اور نزول قرآن مجید کے بعد رسالت محمدی اور قرآن مجید کے کتاب الہی ہونے کا اقرار و عقیدہ بھی توحید کیلئے قطعی طور پر لازم ہو گیا ہے۔ اس لئے کہ توحید حقیقی کی معرفت اور اس طرز فکر سے واقفیت جو توحید تک رہبری کرے بغیر قرآن مجید کو کتاب الہٰی اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول تسلیم کئے ہوئے ممکن ہی نہیں ہے اس لئے کہ اس کی تشریح صرف انھیں دونوں نے کی ہے۔ ہم کسی کو رسالت محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اقرار یا قرآن مجید کو کتاب الہی ماننے کیلئے مجبور نہیں کرتے لیکن جو شخص عقلی زندگی اور اس سے منافع حاصل

کرنا چاہے اس کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنا مرکز حیات بلند و برتر اور عقلی زندگی سے مناسبت رکھنے والا معین کرے۔ اسی تعین مرکز کا نام توحید ہے پھر توحید خود بخود اس کو مندرجہ بالا دونوں امور کے اقرار پر مجبور کر دیتی ہے اس لئے کہ یہ دونوں اس کے غیر منفک اور ناقابل انفصال لوازم ہیں۔

توحید کے لوازم یہیں پر نہیں ختم ہو جاتے ہیں بلکہ ایک چیز اور بھی ہے جو خود بخود اس کی طرف کھنچ کر آجاتی ہے اور انسانی ذہن اس کو اپنے اندر جگہ دینے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ اگر وہ شئے انسانی ذہن میں نہ پائی جائے تو توحید کی افادیت ختم ہو جاتی ہے اور اس کا کوئی اثر انسان کی خارجی اور عملی زندگی میں نہیں ظاہر ہو سکتا۔ یہ کیا شے ہے؟ اس کا نام عقیدۂ آخرت ہے۔ یعنی ایک ایسے عالم کا عقیدہ جو اس مادی عالم سے بالاتر ہے اور جہاں ہمارے مرکز فکر کی افادیت مشاہدہ سے ظاہر ہوگی اسی کے لحاظ سے ہمارے افعال و اخلاق کی صحیح قدر و قیمت واضح ہوگی۔ اگر یہ عقیدہ انسانی ذہن میں نہ موجود ہو تو توحید کا دائرہ محض علمی و فکری زندگی تک محدود ہو کر فنا ہو جائے گا اور ایک دن ہم اس اعلیٰ مرکز حیات سے محروم ہو جائیں گے جو ارتقاء انسانی کی اصل و بنیاد اور اس کا حقیقی ضامن ہے علاوہ بریں اگر آخرت کا وجود نہ ہو تو جزا و سزا کا کوئی صحیح قانون ہی باقی نہیں رہتا ہے یہ ظاہر ہے کہ بہت سے جرائم ایسے ہیں اور بہت سے مکارم ایسے ہیں۔ جن کی سزا و جزا اس عالم میں دینا ناممکن ہے۔ مثلاً اجتماعی جرائم یا اجتماعی مکارم کی سزا و جزا دیہاں نہیں دی جا سکتی۔ ایک شخص لاکھوں انسانوں کے

قتل کا سبب بنتا ہے۔ اس کا قتل کر دینا اس کے جرم کی صحیح سزا نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح ایک شخص کی وجہ سے لاکھوں بندگان الٰہی کو نفع پہونچتا ہے اگر ہم اس کو کوئی فائدہ یہاں پہنچا دیتے ہیں تو یہ اس کے احسان کا پورا بدلہ نہیں ہے اس صحیح توازن کے لئے ہم کو ایک ایسے عالم کی ضرورت ہوتی ہے جو ان طبعی قوانین کے زیر اثر نہ ہو جن کے زیر اثر یہ عالم دنیا ہے تاکہ اس میں فعل اور اس کی جزا میں پوری مساوات قائم کی جا سکے۔

یہی نہیں بلکہ آخرت کا تصور مٹ جانے کے بعد اعمال و اخلاق کا کوئی معیار بھی ہمارے پاس نہیں رہ جاتا ہے ہم کسی عمل کو اچھا یا برا کہنے کا کوئی صحیح اصول نہیں قائم کر سکتے یہ موقع اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کا نہیں ہے۔ اشارۃً ہم نے چند امور ذکر کر دئے۔

الحاصل انسانی ذہن میں توحید کا تصور جب بھی داخل ہوگا تو اپنے ان لوازم کو ساتھ لے کر داخل ہوگا جس طرح آفتاب جب بھی طلوع ہوگا تو اس کے ساتھ اس کے نور کا ہونا لازم ہے اسی طرح توحید کے عقیدہ کے لئے رسالت (بلکہ رسالت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم) اور معاد (آخرت) کے عقائد کا ہونا بھی لازم و لابدی ہے کوئی توحید بغیر ان دونوں عقیدوں کے نہیں پائی جا سکتی۔ اگر کوئی شخص توحید کا مدعی ہے اور ان دونوں عقیدوں کا منکر ہے تو وہ شخص فریب میں مبتلا ہے یا فریب دینا چاہتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص توحید کا عقیدہ رکھتا ہو اور ان دونوں امور کا انکار کر سکے۔

گزشتہ سطور سے یہ امر بھی روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے کہ

پورے اسلامی نظام کی اصل و اساس توحید ہے۔ جس کے متعلق ہم چاہتے ہیں کہ تمام عالم کا مرکز حیات بن جائے۔ اور اسی مرکز حیات کی جانب ہم دنیا کو دعوت دیتے ہیں اور باصرار صرف اسی کی طرف دنیا کو بلاتے ہیں۔ اس دعوت کی ضرورت پچھلے صفحات میں واضح کی جا چکی ہے۔ ہم کسی سے اس کے علاوہ کسی شئے کا مطالبہ نہیں کرتے نہ ہم کسی سے یہ کہتے ہیں کہ وہ توحید کے ساتھ رسالت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آخرت پر بھی عقیدہ رکھے اور اس کا بھی قائل ہو۔ لیکن اس کو ہم کیا کریں کہ توحید کا عقیدہ اس وقت تک قایم ہی نہیں ہو سکتا جب تک یہ دونوں عقیدے اس کے ساتھ شامل نہ ہوں۔ اس لئے اگر کسی کو توحید عزیز ہے اور اس کے منافع سے بہرہ اندوز ہونا ہے تو وہ خود بخود ان دونوں اذعانات کی طرف رجوع ہوگا۔

فکری انقلاب

توحید کے انقلاب انگیز اثرات اور اس کے منافع کا احاطہ دشوار ہے۔ لیکن مشتے نمونہ از خروارے اس پر روشنی ڈالنا غالباً نامناسب نہ ہوگا۔

نیا فکری نظام

توحید مرکز حیات کا نام ہے اس لئے اس کے اثرات کا دائرہ کل انسانی زندگی کو احاطہ کئے ہوئے ہے مگر چونکہ اس کا اولین تعلق عقل و ذہن سے ہے

اس لئے وہی اس کے اولین اثرات کو بھی قبول کرتے ہیں یعنی توحید سے سب سے پہلے انسان کی فکری و ذہنی زندگی میں انقلاب رونما ہوتا ہے یہ انقلاب اس قدر زبردست ہوتا ہے جو اس کی فکری حیات کو یکسر بدل دیتا ہے اس کا قوام فکر اور مہج فکر دونوں نئی زندگی حاصل کرتے ہیں اور ان میں عظیم الشان تغیرات رونما ہوتے ہیں۔

ان تغیرات کا رُوح ارتقا کی جانب ہوتا ہے نہ کہ انحطاط کی جانب، ایسا ارتقاء جو غیر متناہی، لا محدود اور انسانیت کیلئے بے انتہا مفید و نافع ہوتا ہے جس سے نوع انسانی کی فطری قوتیں اور صلاحیتیں قوت سے فعل میں آتی ہیں اور لازوال ترقی کے درجہ کمال پر پہونچتی ہیں۔

فکر انسانی کی یہ ارتقائی حرکات تین حدود کے درمیان ہوتی ہیں جن کا نام توحید، رسالت اور آخرت ہے۔ پھر دونوں موخر الذکر، اول الذکر یعنی توحید میں جذب ہوتے ہیں اور اس کی تحلیل کرنے سے برآمد ہوتے ہیں، ان حدود ثلثہ سے جو دائرہ پیدا ہوتا ہے وہ اس قدر وسیع ہوتا ہے کہ تمام کائنات اس کے اندر داخل ہو جاتی ہے۔ اور فکری حدود کے ماوراء صرف وہی ہستی رہ جاتی ہے جو درحقیقت ماوراء فکر ہے۔ اس طرح انسانی فکر کا نقطہ آغاز وہی بنتا ہے جو بالآخر اس کا نقطہ انجام بھی ہوتا ہے۔ یعنی وہ اپنی فکر کو ایک ایسی ہستی کے تصور سے شروع کرتا ہے جو ہر طرح واحد اور کامل ہے۔ اور فکری میدان میں جولانیاں دکھانے کے بعد جب اس کا رہوار عقل تھکتا ہے تو وہ اسی ذات کے سائے میں پناہ لیتا ہے اور اس سے ایک

تازہ قوت حاصل کر کے دوبارہ تگ و دو میں مصروف ہو جاتا ہے۔

ہر شے کی قوت و طاقت کا حقیقی سرچشمہ اس کا مرکز ہوتا ہے' اسی قاعدے کے بموجب ہم توحید کو علوم و فنون انسانی کا مرکز ہونے کی حیثیت سے ان کی طاقت و قوت کا حقیقی سرچشمہ بجا طور پر کہہ سکتے ہیں۔ علوم و فنون کا نشو و ارتقا درجہ کمال کو اس وقت تک نہیں پہونچنے پاتا جب تک کہ وہ اس سرچشمہ سے طاقت و قوت نہ حاصل کرتے رہیں اور اس تعلق کے بغیر علوم و فنون کی عمر کم اور ان کی نشو و نما کمزور ہو جاتی ہے۔ اور بہت تھوڑے عرصہ تک پھیلنے کے بعد ان میں کمزوری شروع ہو جاتی ہے اور ان کی ترقی رک جاتی ہے۔

نشو و ارتقا کی یہ طاقت جو علوم و افکار انسانی کو توحید یعنی اس کے مرکز حیات سے حاصل ہوتی ہے ایک ایسے نظم کی حامل ہوتی ہے جو ان کو منظم و مربوط بھی رکھتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کو ایسے راستوں پر چلاتی ہے جو فطرت انسانی کے ساتھ مناسبت رکھنے کی وجہ سے بنی نوع انسان کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید ہو جاتے ہیں اور مضرت و نقصان سے قطعاً پاک ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ توحید انسان کی اخلاقی حس کو بیدار کرتی ہے جس سے علوم و افکار کے جذباتی و شہوانی دواعی فنا ہو کر صحیح عقلی روحانی اور اخلاقی دواعی برانگیختہ ہوتے ہیں اور انسان حصول علم کا مقصد کسی اخلاقی شے کو قرار دیتا ہے نہ کہ محض نفسانی شے کو موحد سائنس میں اپنے دل و دماغ کی قوتوں کو اس لئے نہیں صرف کرتا کہ

اس سے محض روپیہ کمایا جائے یا بنی نوع انسان کی ہلاکت کا سامان مہیا
کیا جائے بلکہ اس کی جدوجہد کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے
نوع انسانی کی بہتر سے بہتر خدمت کی جائے اور اس کو زیادہ سے زیادہ
راحت پہونچائی جائے۔ پھر اس میدان جدوجہد میں اس کو کوئی رکاوٹ
بھی نہیں پیش آتی اس لئے کہ وہ کل کائنات کو اپنی فکر کی جولانگاہ سمجھتا
ہے۔ اور مخلوقات کی کسی شئے کو ماوراء فکر نہیں سمجھتا۔ وہ سمندروں کو کھنگال
ڈالتا ہے، ہواؤں کو اڑا دیتا ہے اور زمین کی طنابیں کھینچ دیتا ہے غرض
کائنات کی کوئی ادنیٰ و اعلیٰ مخلوق اس کی تیز اور دقیقہ رس نظروں سے
مخفی اور اوجھل نہیں رہنے پاتی اس لئے کہ وہ موحد ہے اور اس کے
عقیدہ میں کائنات اس کے انتفاع کے لئے ہے اور قدرت نے اس کو اس
کے لئے مسخر کر دیا ہے۔

مقابلہ اور امثلہ

جو کچھ ہم نے کہا ہے یہ مجرد دعاوی نہیں ہیں بلکہ ایسے امور ہیں جو تجربہ
اور مشاہدے سے ثابت ہیں اور ہمارے ان دعاوی کی تصدیق وہ خونی
تحریریں کر رہی ہیں جو زمانہ کے ہاتھوں دنیا کی کتاب پر آج کل لکھی جا
رہی ہیں جو صاف طور پر کہہ رہی ہیں کہ توحید کا فکری سرچشمہ ترک کرنے
کے بعد انسان کی فکری علمی ترقی کس قدر محدود کس قدر ناپائدار اور کس قدر
ہلاکت آفریں ہوتی اور دہریت (Atheism) پر مبنی علوم وفنون

انسان اور انسانیت کیلئے رحمت کے بجائے بدترین لعنت ثابت ہوتے ہیں بہتر یہ ہے کہ ہم گزشتہ تاریخ پر بھی ایک طائرانہ ہی نظر ڈالیں اور مختصراً یہ دکھائیں کہ غیر توحیدی فکری نظام کی خاصیت ہی یہ ہے کہ وہ انسانیت کیلئے ایک لعنت عظمیٰ اور مصیبت کبریٰ ثابت ہوتا ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں توحید سے پیدا ہونے والا نظام فکر انسان کی ترقی و راحت کا صحیح ضامن ہوتا ہے۔

علوم و فنون کی تاریخ میں مصر و یونان کے نام سرورق پر تحریر ہیں۔ مصر غالباً سب سے قدیم قدرداں علوم ہے۔ ان دونوں ملکوں کے علمی فکری عروج و زوال پر نظر کرو تو صاف معلوم ہوگا کہ توحید کی طاقت نہ رکھنے کی وجہ سے ان کے علوم میں کس قدر جلد ضعف و اضمحلال پیدا ہوگیا اور کس طرح ان میں سے نشو و نما کی طاقت زائل ہوگئی۔

مصر علمی میدان میں گامزن ہوا اور نہایت تیزی کے ساتھ بڑھا مگر شرک کے چشمہ میں یہ طاقت کہاں کہ وہ غیر محدود عرصہ تک نہ سہی عرصہ دراز ہی تک چمن علم کی آبیاری کرتا رہتا۔ چشمے خود خشک ہوتے گئے اور انھیں کے ساتھ یہ چمن بھی خشک ہوگیا۔ سیکڑوں برس کی علمی زندگی میں بھی مصری علوم کے مسائل ایک حد معین سے آگے نہ بڑھے۔ چند مسائل اور چند فنون کچھ ریاضی کے متعلق، کچھ سائنس، کچھ سحر و ساحری اور کچھ طب و نجوم کے متعلق یہ کل کائنات مصری علوم کی تھی جس میں صدیوں کی جد و جہد کوئی مزید اضافہ نہ کرسکی۔ باوجودیکہ حکومت و سلطنت نہ صرف علوم کی سرپرست

تھی بلکہ اس کا سارا کارخانہ انھیں حاملین علوم وفنون کے زور پر چلتا تھا۔ فراعنہ کی حکومت کا ساحروں، کاہنوں اور سائنس دانوں کے بل بوتے پر قایم ہونا تاریخ کا واضح مسئلہ ہے۔

مصری علوم کے ناقابل ارتقا ہونے کا ثبوت میں محض "آثار قدیمہ" سے نہیں دوں گا بلکہ ایک نفسیاتی اور عقلی دلیل بھی اس کے لئے پیش کروں گا۔ میری اس دلیل کا مختصر عنوان "سعی اخفاء" ہو سکتا ہے۔ جب علوم کے مسائل محدود ہو جاتے ہیں اور اس امر کا اندیشہ ہوتا ہے کہ ہر شخص ان کو معلوم کر کے اپنے سے متقدم لوگوں کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتا ہے تو ان علوم کے اخفاء کی کوشش شروع کی جاتی ہے۔ دنیا کے واقعات پر نظر کرو تو صاف نظر آئے گا کہ علوم کے اخفاء کی کوشش اور ان کو سینہ بسینہ رکھنے کی سعی علوم کے دور ترقی میں کبھی نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ اس وقت اس کے حاملین کو اپنے تبحر کا سکہ عوام پر بٹھانا ہوتا ہے اور ان کو یہ بھی اطمینان ہوتا ہے کہ اگر ہم دس مسائل کسی شخص کو بتا دیں گے تو وہ ہمارے مساوی نہ ہو سکے گا اس لئے کہ ہم ان میں دس مسائل کا مزید اضافہ کر سکتے ہیں بخلاف اس کے جب علوم کا دور انحطاط ہوتا ہے تو اپنی برتری اور امتیاز باقی رکھنے کے لئے یہ حاملین علم علوم کو مخفی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ایک نفسیاتی اصول ہے جس کی شہادت تاریخ دیتی ہے اس کی روشنی میں جب ہم مصر کی علمی تاریخ پر نظر کرتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں "سعی اخفاء" کا یہ دور بہت جلد آگیا تھا، اور اس وقت تک

باقی رہا جبکہ حوادث وانقلابات نے ان کے جاہ وجلال کا خاتمہ کر دیا۔

بیشک یونان کی علمی عظمت کا اعتراف دنیا کو ہے لیکن اس کی علمی ترقی کا دور کتنا رہا؟ فلسفہ، ریاضی، علوم تمدن، ادب، یہ چیزیں یونان کی سرمایہ ناز تھیں۔ انہی میں انہوں نے ترقی کی اور کچھ عرصہ تک ترقی کرتے گئے۔ مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد شرک کے "پائے چوبین کی بے تمکینی ظاہر ہو گئی اور یونانی علوم وادب" زہرہ ومشتری" کی دیویوں تک محدود ہو کر رہ گئے۔ نہ ان کے مسائل میں بڑھنے کی صلاحیت رہی اور نہ ان کی معتدبہ تعداد طے شدہ ہو سکی بلکہ بالآخر تو یونان کے علمی ذخیرہ میں چند محدود، ناقابل ارتقا اور غیر فیصل شدہ مسائل کے سوا کچھ نہیں رہ گیا، پھر ان میں بھی اوہام وخرافات بہت کثرت کے ساتھ شامل ہو گئے" یہی غیر معتدبہ اور غیر مفید ذخیرہ آج ہمارے سامنے ہے جو اپنا ماتم خود کر رہا ہے اور زبان حال سے ہمارے اس بیان کی تائید کر رہا ہے۔

یہ محض شرک ہی کا اثر تھا کہ نہ صرف یونانی علوم محدود ہو کر یا بالفاظ دیگر ٹھٹھر کر رہ گئے بلکہ ان کے حاملین کا ذہنی رجحان بھی علوم کی تحدید کی جانب ہو گیا تھا۔ اس کا مشاہدہ یونانی فلسفہ میں ہوتا ہے۔ یونانی فلسفی کل عالم کو محدود کر کے افلاک کے خانہ میں بند کر دیتا ہے۔ دنیا کے کل حوادث وتغیرات کو عناصر کی زنجیروں میں باندھ دیتا ہے اور ان عناصر کو بھی چار کے عدد کی چار دیواری میں مقید کر دیتا ہے۔

یونانی طبیب دنیا کے کل امراض کو اخلاط اربعہ ہی کے عدم توازن میں

محدود کر دیتا ہے۔ اور اسی تنگ زاویہ نگاہ سے جسم انسانی کا مشاہدہ کرتا ہے۔ الحاصل ہر یونانی علم و فن میں ہو مضحکہ خیز اور مضرت رساں تنگ نظری اور تحدید افکار و علوم کا رجحان شاہد ہے۔

کلام طویل ہو جائے گا ورنہ یونانی علوم کے دوسرے حامل روم کی مثال بھی پیش کرتا۔ مگر اس کو چھوڑ کر اب مشاہدات پر آئیے اور یورپ کو دیکھئے جو آج بھی گہوارہ علم ہے اور جس کی علمی دھاک تمام عالم پر بیٹھی ہوئی ہے۔

یورپ میں علم و فکر کی بنیاد الحاد و دہریت پر رکھی گئی ہے مگر فطرت انسانی کے خاصہ نے ان کو طبعی قوتوں کے آگے سربسجود اور اپنے نفس کا عبد مطیع بنا دیا ہے۔ اس اختیاری لامرکزیت اور جبری مرکزیت نے ان کو ایک عجیب ذہنی کشمکش میں عرصہ تک مبتلا رکھا جس کا اثر ان کے علوم و فنون میں بہت ہی نمایاں ہے اور صاف طور پر محسوس ہوتا ہے کہ ان کے علوم و فنون کے اکثر مسائل تعین و وثوق کے درجہ پر پہونچنے سے محروم ہیں۔

وہ لوگ جن کے ذہن و دماغ مغربی دماغ سے مرعوب ہو چکے ہیں اور جو خود حقارتی مرکب (Inferiority Complex) کے ذہنی مرض میں گرفتار ہیں مغرب کی علمی زندگی میں کسی نقص کا مشاہدہ نہیں کر سکتے لیکن آزادی کے ساتھ نظر کرنے والا انسان مغربی علوم میں اس چیز کو آفتاب سے زیادہ روشن طریقہ پر دیکھتا ہے کہ ان میں سے نشو و ارتقاء کی قوت فنا ہو چکی ہے اور ان کا دور انحطاط شروع ہو گیا ہے۔

نیچر جو ان کے علوم و افکار کا مرکز اور ان کی زندگی کا محور ہے اس نے اپنی پوری طاقت ان کے لئے وقف کر دی اور جہاں تک اس سے ممکن ہوا اس نے ان کی امداد کی لیکن اب خود نیچر کی طاقت اس سے قاصر ہے کہ وہ ان میں مزید وسعت و ترقی پیدا کر سکے اس لئے کہ اس کی قوت بھی محدود ہے اور وہ علوم و فنون کو ایک حد تک ہی پہونچا سکتی ہے جس سے آگے بڑھانے سے وہ معذور ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اب اسی آخری حد پر یورپ کے علوم و فنون پہونچ چکے ہیں اور اب ان میں مزید وسعت و ترقی کی قطعاً گنجایش نہیں ہے۔

مغرب کی علمی تاریخ اور موجودہ علوم مغربی کا گہرا مطالعہ ہمارے اس دعوے کا ثبوت دے گا پھر یونان و دیگر علمی ممالک کی علمی تاریخ اس ثبوت کی تائید کرے گی۔ جس طرح یونان میں ارسطو کے بعد کوئی دوسرا ارسطو نہیں پیدا ہوا تھا اسی طرح سرزمین مغرب ایک مِل کے بعد دوسرا مِل، ایک ایڈیسن کے بعد دوسرا ایڈیسن ایک ہنمین کے بعد دوسرا ہنمین پیدا کرنے سے قاصر رہی ہے۔ علوم کے دور ترقی میں فطری صلاحیتیں رکھنے والے متاخرین اپنے متقدمین سے بازی لے جاتے ہیں۔ ارسطو اپنے استاد افلاطون سے علمی دنیا میں فائق تسلیم کیا جاتا ہے لیکن دور انحطاط میں اس کے برعکس ہوتا ہے چنانچہ مغرب میں اسی کا مشاہدہ ہو رہا ہے اور یہ اس کا ثبوت ہے کہ مغربی علوم کا دور انحطاط و زوال شروع ہو چکا ہے۔

ان کتابوں کے دیکھنے سے جو یورپ کی ایجادات اور انکشافات کے

متعلق شائع ہوئی ہیں صاف طور پر یہ پتہ چلتا ہے کہ بیسویں صدی یورپ کی علمی زندگی کے لئے بہت منحوس ثابت ہوئی ہے۔ اس صدی کا تقریباً نصف حصہ گزر چکا ہے اس میں شاید ایک بھی اصولی اور بالکل جدید اختراع یا دریافت کا پتہ نہ لگے گا بخلاف اس کے انیسویں صدی کا اتنا ہی زمانہ لے کر اس کا مقابلہ اس صدی کے نصف سے کرو تو نمایاں فرق محسوس ہوگا انیسویں صدی کا اتنا ہی زمانہ یورپ کی بہت سی ایجادات اور بہت سے انکشافات کو پیش کر سکے گا جس کے مقابلہ میں بیسویں صدی کا یہ نصف حصہ صرف ان اختراعات و انکشافات کی تکمیل کو پیش کر سکتا ہے جو انیسویں صدی کے کسی نہ کسی حصہ میں ہو چکی ہیں۔ ہوائی جہاز، توپ، مشین گن اور اسی قسم کی دوسری چیزیں ان سب کی اصلیں انیسویں صدی میں ہی دریافت میں آچکی تھیں۔ بیسویں صدی میں ان کو صرف مزید ترقی دے دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس صدی میں کچھ بھی نہیں ہوا ہے واقعہ تو یہ ہی ہے مگر علوم کی ترقی کا اقتضا اس کے بالکل برعکس ہے۔ اگر علوم مغربی رو بہ ترقی ہوتے تو بیسوی صدی ایجاد و اختراعات اور علمی و فنی انکشافات کے لحاظ سے انیسویں صدی سے کہیں فائق و برتر ہوتی۔

اور آگے بڑھئے، علم طب (میڈیکل سائنس) علوم کے کل شعبوں میں سب سے فائق ہے اس لئے کہ یہ سب سے زیادہ مخلوقات الٰہیہ کے لئے مفید ہے۔ اس کا (اور اسی کا نہیں بلکہ ہر علم کا) قاعدہ ہے کہ وہ جب تک ماہرین اور رجال فن کے ہاتھ میں رہتا ہے اس وقت تک اس میں زندگی

رہتی ہے۔ اس لئے کہ یہ ماہرین اپنی پوری کوشش اس کی ترقی ونگہداشت میں صرف کرتے ہیں لیکن جب یہ عوام کے ہاتھ میں آجاتا ہے تو رفتہ رفتہ اس کی ترقی رک کر یہ فنا کے گھاٹ اتر جاتا ہے کیونکہ اس کا کوئی حقیقی والی وارث نہیں رہتا طب یونانی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ جب تک اس کے مخصوص ماہرین رہے اور عوام ان کے محتاج رہے اس وقت تک اس میں زندگی وطاقت باقی رہی لیکن اب "پیٹنٹ ادویہ" اور اشتہاری دواخانوں کی بدولت عوام الناس خود کو اطبا کا محتاج نہیں سمجھتے۔ اس لئے ماہرین فن "النادر کالمعدوم" کے زمرے میں داخل ہوتے جارہے ہیں اور طب یونانی نزع کی ہچکیاں لے رہی ہے۔

ہم لوگ تو ہندوستان کے ڈاکٹر کو دیکھتے ہیں جس کی اونچی دوکان ہوتی ہے اور لمبی فیس، اور مزاج کا حال معلوم کرنے کے لئے جن کے پاس انگلینڈ یا امریکہ یا جرمنی کا بنا ہوا تھرمامیٹر رہتا ہے۔ مگر ذرا یورپ میں جاکر دیکھئے کہ اسی ڈاکٹر کی کیا قدر ہے وہاں بھی اب مغربی طب "عوام کی طب" بن چکی ہے۔ شاید اتنی تو نہیں جتنی ہندوستان میں طب یونانی مگر اسی کے لگ بھگ ضرور پہونچ گئی ہے۔ اور یہ درجہ بھی دور نہیں مشاہدہ انگریزی اخبارات میں ادویہ کے اشتہارات سے ہوسکتا ہے جن کی موجودگی میں ڈاکٹر کی احتیاج شاذونادر ہی پڑسکتی ہے بلکہ اب تو ہندوستان کا ڈاکٹر بھی انھیں اشتہاری دوافروشوں کا محتاج ہے۔ اگر آپ کو ڈاکٹری علاج کا اتفاق خدانخواستہ ہوا ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ پیٹنٹ اور

اشتہاری دواؤں کے کتنے ڈبے کنٹر اور کتنی شیشیاں آپ کے یہاں ڈھیر ہو گئی ہونگی۔ اس حالت پر پہنچنے کے بعد یہ یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ مغربی طب کا بھی اب دم واپسیں ہے اور کچھ عرصہ کے بعد یورپ میں شاید ڈاکٹروں کی وہی وقعت رہ جائے گی جو ہندوستان میں جراحوں کی ہے۔ چنانچہ مطالعہ کتب فن اس حقیقت کی شہادت دے رہا ہے۔

علم النفس (Phsychology) کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ آج بھی ترقی پذیر علم ہے۔ کسی علم میں چند جزئیات کا اضافہ اگر ترقی کہلاتا ہے تو واقعی اس میں ترقی ہو رہی ہے۔ ہم اس کے مدعی کب ہیں کہ کسی مغربی علم میں اب کسی مسئلہ کا اضافہ ہونا ناممکن ہے سوال تو رجحان عام کا ہے۔ غور کرو تو اس میں بھی انحطاط کی جانب رجحان پایا جاتا ہے نراڈ جو اس زمانہ میں علم النفس کیلئے مستند (Authorized) مانا جاتا ہے اس کی تصانیف ہی دیکھنے سے اس رجحان انحطاط کا صاف پتہ لگتا ہے بشرطیکہ یہ نظر مرعوبیت کی نظر نہ ہو۔

علوم تمدن کا جہاں تک تعلق ہے ان سے یورپ پہلے بھی کورا تھا اور آج بھی کورا ہے اور ان میں علم و عمل دونوں کے لحاظ سے جہاں تک ناشائستگی اور بے تہذیبی کے جس مقام پر وہ شروع میں تھا اس سے کہیں نیچے درجہ پر آج ہے۔ علم اخلاق (Ethics) میں آج تک وہ خیر و شر (Good and Evil) کا کوئی صحیح تصور نہیں پیش کر سکا سیاست کے کل نظریات کی آزمائش اس نے کی اور سب میں ناکامیوں کا

منہ دیکھا۔ معاشی نظریات کا بھی یہی حال ہے۔ قانون میں اب تک وہ "حق"[1] کا کوئی واضح تصور نہیں پیش کر سکا جس پر سارے قانون کی بنیاد ہے۔

ان کل امور پر نظر کرنے سے صاف طور پر ہمارے اس دعوے کی تائید ہوتی ہے کہ یورپ کے علوم و فنون اب مائل بہ زوال و انحطاط ہیں اور اب ان میں وسعت و ترقی اور نشو و نما کی طاقت نہیں باقی رہی ہے حالانکہ ان علوم و فنون پر ابھی پوری دو صدیاں بھی نہیں گزری ہیں۔ اس قدر قلیل عرصہ میں ان پر نزعی کیفیت طاری ہونے کا سبب محض توحید سے محرومی اور ایک کمزور مرکز حیات سے تعلق ہے جس کی محدود طاقت اب ان کو آگے لے چلنے سے قطعاً قاصر ہو چلی ہے۔

یہ بحث بہت ہی مفید ہے اس لئے باوجود سعی اختصار اس میں گونہ طوالت ہو گئی لیکن افادیت کو دیکھتے ہوئے غالباً اس کی طوالت ناظرین کرام پر گراں نہ ہو گی۔ اس لئے کچھ مزید لکھنے کی جرات ہوتی ہے اور میں اتنا اور دکھانا چاہتا ہوں کہ جن قوموں نے پہلے توحید کو مرکز افکار قرار دے کر پھر اس سے کسی نہ کسی درجہ میں علیحدگی اختیار کی ان کی علمی ترقی کی رفتار کس طرح سست پڑ کر ختم ہو گئی۔

اس سلسلہ میں دو قومیں نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں ایک بنی اسرائیل

---

[1] RIGHT

. اور دوسرے مسلمان،

بنو اسرائیل کے علوم و فنون کی بنیاد توحید پر رکھی گئی تھی لیکن بہت تھوڑے عرصہ کے بعد انھوں نے اس مرکز سے گونہ بُعد اختیار کیا اور اپنا علمی مرکز دوسرا (غیر اسلامی) تلاش کر لیا۔ مراکز کی اس ثنویت اور اس دو عملی نے ایک عرصہ تک ان کو ذہنی کشمکش میں مبتلا رکھا اور بالآخر پہلا نتیجہ تو یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ ان کا علمی مرکز جو غیر اسلامی تھا ان کی پوری زندگی کا مرکز بن گیا اور وہ از سر تا پا شرک و ضلال میں مبتلا ہو گئے اور دوسرا اثر یہ ہوا کہ ان کی علمی ترقی رک گئی اور بہت تھوڑے عرصہ میں وہ ذہنی افلاس میں مبتلا ہو کر پستی و ذلت کے گڑھے میں گر گئے۔ سورہ بقرہ میں ان کی اس غلطی کو واضح طور پر بیان فرمایا گیا ہے[1]۔ مسلمانوں کی حالت بھی کچھ ایسی ہی ہوئی ان کے دماغ کو ایک نئے سانچے میں ڈھالا گیا تھا اور موحدانہ طریق فکر ان کو عطا کیا گیا تھا۔ جب تک اس سے انھوں نے کام لیا ترقی کی، اور اس کو جب سے انھوں نے ترک کیا ان کی علمی ترقی کی رفتار سست ہو گئی یہاں تک کہ وہ بالکل رک گئی اس مسئلہ کو ہم قدرے تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

عالم کے معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کی ایک جماعت (صحابہ کرام) کے دماغ کو ایک خاص سانچے میں ڈھالا، علوم و افکار انسانیہ کا

---

[1] ولما جاءهم كتاب من عند الله مصدق لما معهم نبذ فريق من أهل الكتاب كتاب الله وراء ظهورهم " آخر رکوع نمبر ۱۲

ایک خاص مرکز مقرر فرمایا جس کا نام توحید ہے، پھر ان میں وہ مخصوص نظر پیدا کی جس سے کائنات کو اس کی صحیح حیثیت میں دیکھا جا سکتا ہے ان زوایائے نگاہ سے آشنا بنایا جو اس مرکز (توحید) کے گرد فکری و عملی زندگی کی گردش سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں تک نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کا کام ختم ہو گیا۔ ان چیزوں سے کام لینا امت کا کام تھا۔ چنانچہ دور صحابہ میں اس کی ابتدا ہو گئی اور صحابہ کرام نے ایک ایسی علمی عمارت کی تعمیر شروع کر دی جس کی بنیاد سرور دو عالم کے دست مبارک نے رکھی تھی اور جو اگر تکمیل کو پہونچ جاتی تو اس کے کنگرے افلاک سے بھی آگے بڑھ جاتے۔

افسوس ہے کہ دور صحابہ کی علمی ترقیات پر میرے علم میں سوا حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے کسی نے توجہ نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرما دیں۔ لیکن انہوں نے بھی جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ بھی مشتے نمونہ از خروارے ہے اور مزید اضافہ کا محتاج ہے مگر یہاں تو اتنا بھی نہیں تحریر کیا جا سکتا، لہٰذا محض چند اشارات پر اکتفا کرتا ہوں۔

انسان و حیوان کے درمیان حقیقی فضل علوم تمدن ہی سے قائم ہوتی ہے۔ اس لئے دور صحابہ میں سب سے پہلے اسی کی طرف توجہ کی گئی سیاسیات، معاشیات، اخلاقیات، عمرانیات، شہریت (Civics)

معاشرت کے اصول کلیہ نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں متعین ہو چکے تھے لیکن ان کے اصول جزئیہ کا استنباط اور ان پر ان کی عمارتیں کھڑی کرنا ان کی تعلیم لوگوں کو دینا اور ان علوم کو علوم کی حیثیت میں

لانا یہ سب کام دورِ صحابہ میں انجام پائے قانون (فقہ) اس کے اصول (جوری پروڈنس) اسی عہد کے کارنامے ہیں یہ دور بہت چھوٹا تھا اور جتنا کام اس قلیل عرصہ میں ہوا اس کی نظیر تاریخ اقوام میں ناپید ہے اور صحابہ کرام کی سیاسی ترقی سے زیادہ حیرت انگیز ہے اور درحقیقت ان کا یہی ذہنی ارتقاء اور ان کی فکری تو قیت ہی وہ چیزیں تھیں جنھوں نے ان کو اقوامِ عالم پر غالب اور ان کا سردار بنا دیا تھا۔

ان کے بعد تابعین کا دور آیا۔ اس میں بھی مسلمانوں کا علمی مرکز اسلامی رہا۔ اس لئے باوجود فتنوں کی کثرت اور بے اطمینانیوں کے مسلمانوں کی علمی ترقی نہایت تیز رفتاری کے ساتھ جاری رہی اصول فقہ و فقہ کی باقاعدہ تدوین ہوئی۔ علم الجدل والخلاف کے نام سے اصول استدلال کی بنیاد رکھی گئی۔ علم انسانی کے فطری ذرائع اور ان کے مراتب کی تعیین ہوئی۔ جز ایک کثیر الوقوع مگر پرخطر ذریعہ علم ہے اس لئے اس کے اصول کی تدوین کی گئی۔ زبان و ادب کے اصول و فروغ کا انضباط ہوا۔ علم کلام کے نام سے مادہ فکر (Object of thought) کے لحاظ سے اصول فکر کی تعیین کی گئی اور یہ بتایا گیا کہ کس نوع کے مواد فکر کس نوع سے مناسبت رکھتے ہیں[۱] اور کون مواد فکر ایسے ہیں جو درحقیقت ماوراء

---

[۱] اس کی تعیین آج تک یورپ و یونان سے نہ ہو سکی۔ دلیل و دعوے کی فطری مناسبت سے یہ لوگ قطعاً بے خبر ہیں اور ایک ہی قسم کا طرز استدلال یہ لوگ ہر جگہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔

فکر میں عملی نفسیات PRACTICAL PHCYCOLOGY کی بنیاد رکھی
گئی۔ جس کا اصطلاحی نام تصوف ہے[۱]۔

مجھے علم نہیں کہ اس دور میں جماعتی نفسیات کی تدوین ہوئی تھی یا
نہیں لیکن متفرق طور پر اس کے نہایت ٹھوس اور دقیق اصول ملتے ہیں
جو زیادہ تر صحابہ کرام کی زبان سے منقول ہیں۔ یہی نہیں بلکہ یہ بھی تقینی
ہے اور واقعات کی بناء پر دعوے کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ حضرات
اس علم میں اس قدر زبردست مہارت رکھتے تھے کہ بلا کسی مبالغہ کے اس
کی نظیر محال ہے۔ مختلف اقوام اور جماعتوں کی نفسیات اور ان کے مزاج قومی
کو وہ اس طرح سمجھتے تھے کہ وہ قومیں خود بھی نہ سمجھ سکتی تھیں اور اس
مزاج شناسی سے وہ بہترین کام لیتے تھے۔ علیٰ ہذا اس دور میں علم الحرب
اور فن حرب کے نئے نئے اصول وضع کئے گئے اور بہترین تدابیر جنگ اختراع
کی گئیں جن پر اصولی درجہ میں آج بھی عمل ہو رہا ہے۔

علوم تمدن ہی وہ حقیقی حد فاصل قائم کرتے ہیں جو انسانیت اور
حیوانیت کو الگ الگ کر دیتی ہے۔ اس لئے ہر ترقی یافتہ جماعت سب
سے پہلے انھیں کی طرف توجہ کرتی ہے۔ علوم طبیعہ کا مرتبہ ان کے بعد آتا ہے

---

[۱] تصوف درحقیقت انھیں نفسی اصول کا نام ہے جن سے کام لے کر اتباع شریعت کا
مرحلہ سہل بنا لیا جاتا ہے جن نفسی حقائق کو تصوف میں واضح کیا گیا ہے ان کی گرد
راہ کو بھی ابھی موجودہ علم النفس نہیں پہونچ سکا ہے ۱۲

یہی وجہ ہے کہ اس دور کے مسلمانوں نے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ توجہ علوم تمدن ہی کی جانب کی اگر زمانہ ساتھ دیتا تو علوم طبعیہ کی جانب بھی توجہ کرتے لیکن افسوس ہے کہ یہ دور بہت تھوڑے عرصہ تک قائم رہا یعنی اس قدر قلیل عرصہ تک رہا جو دراصل ترقی اقوام کیلئے بالکل غیر معتد بہ ہے اور اس میں ان لوگوں کی اس قدر زبردست ترقی حقیقتاً ایک معجزہ تھی تاہم ان علوم سے بھی یہ لوگ کلیتہً غافل نہیں رہے ریاضی میں خاص طور پر انھوں نے ایجاد و اختراع اور مہارت کا ثبوت دیا اس کے بالکل جدید اور نہایت سہل اصول و قواعد انھوں نے وضع کئے جو اب تک بھی فرائض و میراث اور دوسرے فقہی مسائل میں رائج ہیں۔

اسی دور میں ایک بالکل نئی طب اور نئے طریق علاج کی بنیاد بھی پڑی تھی۔ حفظان صحت کے بہترین اصول وضع کئے گئے۔ انجنیری اور زراعت میں بھی مہارت و اختراع کا ثبوت ملتا ہے۔[1]

الحاصل اس دور میں توحید کو مرکز افکار و علوم بنا کر اور کتاب و سنت کے نہج فکر کو اختیار کر کے ایک نئے نظام علم کی بنیاد ڈالی گئی تھی جس کی ترقی کی رفتار اس قدر تیز تھی کہ اگر باقی رہتی تو آج دنیا خدا جانے ترقی کی کس منزل پر ہوتی اور بعض امور میں تو یہ علمی ترقی اس قلیل عرصہ میں ہی

---

[1] ان کل امور کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کرنے کے لئے کتب حدیث، سیر، تاریخ کے علاوہ کتب فقہ و علم کلام وغیرہ دیکھئے "ازالۃ الخفا" میں بھی منتشر طور پر بہت سا مواد موجود ہے ۱۲

ایسے منازل پر پہونچ گئی تھی جن پر آج تک دنیا نہیں پہونچ سکی ہے اور نہ غالباً مستقبل میں پہونچ سکے گی۔

دورِ صحابہ اور دورِ تابعین دونوں اس قدر متصل ہیں کہ یہ بتانا بہت دشوار ہے کہ کونسی ترقیات کس دور میں ہوئیں؟ لیکن اتنا یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ قریب قریب ان کل علمی و فنی ترقیوں کی بنیاد صحابہ کرام ہی کے مبارک و مقدس ہاتھوں سے رکھی گئی تھی۔

افسوس ہے کہ مسلمانوں اور اسلام کے اس حقیقی دورِ ترقی کے ساتھ بہت بے اعتنائی برتی جاتی ہے خصوصاً اس عہد کی علمی ترقیوں کو قطعاً نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اگر اس عہد پر نظر ڈالی جاتی ہے تو محض فتوحات کی حیثیت سے حالانکہ یہ چیزیں ان سے زیادہ حیرت انگیز ہیں۔

خیر تو یہ دور بہت جلد ختم ہو گیا اور اس ذہنی و علمی عمارت کی صرف بنیادیں تیار ہو سکی تھیں کہ مسلمانوں نے اپنا نہج فکر بدل دیا۔ یونانی فلسفہ وہی تنگ دامن فلسفہ جس نے ارسطو کے بعد ایک بھی ارسطو نہیں پیدا کیا تھا۔ اور جو صدیوں میں بھی ایک قدم آگے نہ بڑھ سکا۔ اب مسلمانوں کا میدان فکر بن گیا۔ افلاطون اور ارسطو کے مزخرفات علم صحیح کے بجائے دماغوں میں جگہ پانے لگے۔ کتاب و سنت کے نہج فکر کو چھوڑ کر یونانی نہج فکر اختیار کیا جانے لگا۔ اور علوم کے اسلامی مرکز کے بجائے یونانی مرکز کو اختیار کیا گیا۔

یہ دور درحقیقت مسلمانوں کے علمی تنزل کا دور تھا جس کو ترقی کا دور سمجھا جاتا ہے۔ ان کی ترقی کی رفتار یہیں سے سست پڑ گئی اور

۵-۶ سو برس صرف کرنے کے بعد بھی وہ علمی ترقی کے ان مراتب نہ پہونچ سکے جن پر درحقیقت ان کو پہونچنا چاہیے تھا۔ اور جو کچھ ترقی انھوں نے اس عرصہ میں کی بھی وہ درحقیقت اوسی اسلامی نہج فکر کی رہین منت تھی جس کی شعاعیں کبھی کبھی پر تو فگن ہو جاتی تھیں۔ ان دلائل اور تجربات کی روشنی میں یہ امر روز روشن کی طرح ظاہر ہو جاتا ہے کہ دنیا کے لئے علمی و ذہنی ارتقا کا واحد راستہ یہی ہے کہ وہ توحید کو مرکز افکار قرار دے۔ مغرب کا پس خوردہ کھانے سے ترقی کا کوئی امکان نہیں ہے جن علوم میں اب نشو و نما کی گنجائش ہی نہ ہو ان میں اپنی سعی کو رائیگاں کرنے سے کیا فائدہ؟ ان میں نشو و نما کی قوت نئے سرے سے پیدا کرنے کی صورت یہی ہے کہ ان پر اسلامی نہج فکر سے نظر ڈالی جائے اور ان کو بالکل نئے سرے سے اور ایک نئے طرز سے دیکھا جائے۔ میرا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ علوم جدیدہ کا مطالعہ لاحاصل ہے۔ بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ مغربی نہج فکر سے ان کا مطالعہ ترقی کے نقطہ نظر سے بھی اب بیکار اور فضول بلکہ مضرت رساں ہے ان سے فائدہ حاصل کرنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ ان کو اسلامی طرز فکر سے دیکھا جائے اور توحید کے مرکز کے ساتھ ان کو مربوط کیا جائے۔[۱]

---

[۱] مسلمانوں کے لئے خصوصاً اور دنیا کے لئے عموماً نصاب تعلیم کی تدوین کے لئے یہ اصول بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وہ نقطہ نظر ہے جس سے اس مسئلہ پر نظر کرنا چاہیے مگر افسوس ہے کہ اب تک ایسا نہیں ہوا۔ ۱۲

یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انسان کی عملی زندگی اسکی علمی زندگی کے کلیتہً تابع ہوتی ہے۔ اس لئے جب تک اس کی اصلاح نہ ہوگی اس وقت تک عملی زندگی کی اصلاح ناممکن ہے۔ علیٰ ہذا اول الذکر کی اصلاح ثانی الذکر کی اصلاح کو مستلزم ہے یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظام میں اس کے فکری نظام کو جزو اعظم اور بنیاد اولین کا مرتبہ حاصل ہے۔ یہی وہ فکری انقلاب ہے جو ہم سب سے پہلے دنیا میں پیدا کرنا چاہتے ہیں جو ایک نئے فکری نظام سے دنیا کو آشنا بنائے گا جس پر ہماری عملی زندگی کی فلاح، کامرانی، و راحت کی اساس قایم ہے۔ اور جس کے رائج ہونے کے بعد دنیا میں عروج و ترقی فلاح و راحت، امن و امان، اطمینان و سکون کا دور دورہ ہوگا اور جس کے اعلیٰ ترین مدارج پر پہونچکر یہ دنیا "جنت ارضی" بن سکتی ہے۔

فکری نظام کا خارجی ظہور

گزشتہ صفحات میں ہم جس فکری نظام کی مختصر تشریح کر آئے ہیں اور جس کا وجود توحید، رسالت اور قیامت کے اذعانات کا رہین منت ہے وہ صرف انسانی ذہن تک محدود نہیں رہتا ہے بلکہ عمل اور کردار کی صورت میں بھی اس کا ظہور ہوتا ہے اس لئے کہ کل افکار کی فطرت کا یہ خاصہ ہے کہ ان کا اثر خارجی زندگی میں یقینی طور پر ظہور پذیر ہوتا ہے بلکہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان کی فکری زندگی اور اس کی خارجی زندگی میں کوئی حقیقی فرق نہیں ہے بلکہ صرف محل اور مقام کا فرق ہے۔ وہی شئے جو ذہن میں رہ کر

فکر کہلاتی ہے خارج میں آکر عمل اور کردار بن جاتی ہے اس لئے انسانی حیات کا خارجی نظام مکمل طور پر اس کے فکری نظام کے تابع بلکہ اس کا عکس ہوتا ہے۔ اگر انسان کی حیات ذہنی عقلی ہے تو اس کی حیات خارجی بھی عقلی ہوتی ہے اور اگر اول طبعی ہے تو ثانی بھی طبعی ہوتی ہے۔

اول الذکر کا اثر ثانی الذکر پر پہلے تو انسان کی انفرادی زندگی میں نمایاں ہوتا ہے اور اس کے بعد اس کی اجتماعی زندگی پر ـــــ یہاں انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ربط و تعلق کا مسئلہ سامنے آجاتا ہے۔ جس میں اسلامی زاویۂ نگاہ غیر اسلامی زاویہ نگاہ سے قطعاً مختلف ہے۔ اسلامی نقطہ نظر واقعات اور ناگزیر و فطری واقعات پر مبنی ہے بخلاف اس کے غیر اسلامی زاویہ نگاہ مجرد قیاس اور جذبات پر موقوف ہے جو شعور انسانی کے طبعی ارتقا سے ظہور پذیر ہوتا ہے اس لئے طبعی قوانین کے ماتحت رہتا ہے، جس کا نتیجہ وہ غیر اسلامی نظریہ ہے جو اس مسئلہ کے متعلق قایم کیا گیا ہے اور جو ہر ایسی قوم میں یکساں طور پر موجود رہا ہے جو غیر اسلامی اصول پر وجود میں آئی اس نظریہ کا ماحصل یہ ہے کہ اجتماع اصل شے ہے اور فرد اس کے تابع ہے۔ فرد کا وجود اجتماع کے لئے ہے اور بغیر اس کے فرد کوئی شے نہیں ہے۔ اس نظریہ کا ایک اثر تو یہ ہوا اور ہونا چاہئے تھا کہ کل توجہات کا مرکز جماعت بن گئی اور فرد کی حیثیت نظر انداز کردی گئی۔ افراد سے اجتماع کا وجود ہوتا ہے۔ صالح افراد صالح جماعت بناتے ہیں اور غیر صالح افراد سے ہمیشہ غیر صالح جماعت کا وجود ہوگا پھر جب

فرد کی تربیت کی طرف سے بے توجہی ہوگی تو اس کا نتیجہ جماعت غیر صالح کا وجود ہوگا جس کا فساد و زوال پر منتج ہونا یقینی ہے۔ اس کی تائید تاریخ اور مشاہدات سے ہوتی ہے۔

اس نظریہ کا دوسرا اثر یہ ہوا کہ فرد و جماعت میں ایک کشمکش پیدا ہو گئی، اس صورت میں فرد کی جماعت سے بغاوت بالکل فطری شے ہے اور نفسیاتی عوامل کی بناء پر وجود میں آتی ہے۔[۵] یہ کشمکش اور بغاوت ابتداءً تو افراد اور ان کے واسطے سے جماعتوں کی ترقی کا سبب بنتی ہے لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہ انفرادیت (Egoism) کو نشو و نما دے کر اولاً اجتماعیت پھر جماعت پھر فرد سب کو فنا و ہلاکت کے غار میں ڈھکیل دیتی ہے۔

اس تکلیف دہ کشمکش کی وجہ سے اس نوعیت کے اجتماعات میں کسی اخلاقی نصب العین کی تعیین نہیں ہو سکتی جماعت ایک اخلاقی نصب العین کی تعیین کرتی ہے بہت تھوڑے عرصہ میں اس کی حیثیت ایک رواج کی ہو جاتی ہے فرد کی ذہانت رواج پرستی کو روا نہیں رکھتی وہ ہر قدیم شے پہ تنقیدی نظر ڈالتا ہے اور ان کی قدامت سے اکتا کر ان کے خلاف بغاوت کرتا ہے رفتہ رفتہ یہ اخلاقی نصب العین جماعت کو بھی چھوڑنا

۵۔ اخلاقیات مولفہ جان ڈیوی نیز دیکھو یونان و روما کی تاریخ اور فرنگی تاریخ کے واقعات و حالات

پڑتا ہے۔ اور کوئی دوسرا نصب العین اختیار کرنا پڑتا ہے کچھ عرصہ کے بعد پھر وہی بغاوت، کشمکش اور تبدیلی معرض وجود میں آتی ہے اور اس طرح اس جماعت اور اس کے کل افراد کی اخلاقی حالت ہمیشہ گرتی رہتی ہے ان میں کردار اور سیرت کا کبھی وجود نہیں ہو سکتا نہ ان میں اخلاقی شعور پیدا ہو سکتا ہے ایسے بے مقصد افراد اور ایسی بے مقصد جماعت کی زندگی کتنی ہو سکتی ہے؟ اور اس کی ترقی میں کتنی پائداری ہو سکتی ہے؟ اس کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔

ایسی جماعت کی یہ سیمابیت زندگی کے کسی پہلو اور کسی شعبہ کے لئے اصول و قانون نہیں مقرر ہونے دیتی۔ نہ اس کی معاشی و سیاسی زندگی کسی متعین اور یقینی راستہ پر چلتی ہے نہ معاشرتی و شہری زندگی۔ آج ایک قانون رواج کے درجہ پر پہونچتا ہے تو کل اس کے خلاف بغاوت شروع ہو جاتی ہے اور وہ مجبوراً بدل جاتا ہے غرض ہر وقت "جرس فریاد می دارد کہ بر بندید محملہا" کا منظر پیش نظر رہتا ہے۔ جیسا کہ آج یورپ میں نمایاں طور پر مشاہدے میں آ رہا ہے۔ جہاں عدل و انصاف اور حق و راستی کل امور بے معنی الفاظ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے ہیں۔

فرد و جماعت کی اس تکلیف دہ کشمکش کا جو ہمیشہ بد امنی کا سبب بنی رہی ہے نتیجہ دو باتوں میں سے ایک ہونا لازمی ہے پہلی صورت تو یہ ہے کہ بالآخر فرد کو غلبہ حاصل ہو اور جماعت پراگندہ ہو کر افراد کی ہیئت اجتماعیہ ختم ہو جائے اس طرح انفرادیت اور فوضویت کا دور دورہ

ہوگا اور بدترین وحشی اقوام سے بھی نیچے کے درجہ پر پہونچ جانا اس کا یقینی اور واضح نتیجہ ہے اس لئے کہ بنی نوع انسان کی ترقی کے لئے اجتماع کی ضرورت بالکل واضح اور روشن چیز ہے۔

دوسری صورت جماعت کے غلبہ کی ہے اس حالت میں فرد کی ذہانت جماعتی اتباع اور رسم و رواج کے سنگ ہائے گراں کے نیچے کچل کر فنا ہو جائے گی جس کا انجام وہی پستی، وحشت، جہالت حیوانیت اور بالآخر فنا ہے۔

دنیا کی گزشتہ تاریخ اور آج کے واقعات ہمارے اس بیان کی تائید کر رہے ہیں۔ اقوام عالم کو دونوں صورتیں پیش آئی ہیں اور دونوں کے نتائج وہ بھگت چکی ہیں۔ آج بھی دنیا نے درمیانی حالتوں سے گھبرا کر دونوں صورتیں اختیار کی ہیں۔ اشتراکیت و اشتمالیت غلبہ اجتماعیت کے مظاہر ہیں نیز نازیت و فاشیت بھی غلبہ اجتماعیت کی دوسری صورتیں ہیں، اور غلبہ انفرادیت کی مثال انارکزم ہے، جس کا مواد غلبہ اجتماعیت کے تلخ تجربات نے ہی پوری طرح پکایا ہے اور جو غالباً عنقریب پھوٹنے والا ہے۔

مندرجہ بالا غیر اسلامی زاویہ نگاہ دراصل ایک دوسری غلطی پر مبنی ہے جو انسان کی ذات اور اس کے غیر کے مابین ربط و تعلق کے متعلق ان لوگوں سے ہوئی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ انسان کو ایک تعلق و ربط تو خود اپنی ذات کے ساتھ حاصل ہے اور دوسرا تعلق اپنے ابنائے جنس کے

ساتھ "ہر انسان اپنی قوم کا بیٹا ہے" اس بات پر ان لوگوں کا ایمان ہے پھر ان دونوں کے ساتھ انسان کا تعلق کسی واسطہ اور وسیلہ کا محتاج نہیں ہے بلکہ قطعاً مستقل ہے۔ یہی وہ نظریہ ہے جس نے دنیا میں تباہی و بربادی پھیلائی ہے جو بنی نوع انسان کی ترقی اور اس کے امن و امان کا دشمن ہے۔

اسلام اس کو تسلیم کرتا ہے کہ انسان کو اپنی ذات اور اپنے ابناء جنس کے ساتھ تعلق ضرور ہے لیکن یہ تعلق بلا واسطہ اور حقیقی نہیں ہے بلکہ ظاہری اور بالواسطہ ہے۔ اس لئے اس تعلق کی بنیاد پر نہ تو کسی اخلاقی نصب العین کی تعیین کی جا سکتی ہے نہ کوئی نظام حیات بنایا جا سکتا ہے انسان اور انسانیت کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ صرف اسی وقت ہو سکتا ہے کہ اس کو انفرادیت واجتماعیت دونوں سے بالاتر مانا جائے۔

انسان کا حقیقی تعلق اسلام کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہے اور وہ اس کا "عبد" (بندہ) اور خلیفہ (نائب) ہے۔ اس کے علاوہ اس کا تعلق جس سے بھی ہے صرف اللہ تعالیٰ کے واسطے سے ہے۔ یہاں تک کہ اس کا تعلق خود اس کے ساتھ بھی اسی واسطہ سے ہے۔ نہ وہ خود اپنے نفس کا ہے، نہ اس کا نفس اس کا ہے، بلکہ دونوں اللہ کے ہیں اور اسی واسطے اس کو اپنے نفس سے تعلق دار تباط ہے۔

اسلام نے جو اجتماعی و اخلاقی نظام و نصب العین پیش کیا ہے اس کی بنیاد اسی نظریہ پر قایم ہے جس کا واضح اور اولین اثر یہ ہے کہ وہ اجتماع جو اسلامی بنیاد پر قایم ہوتا ہے اس میں فرد و جماعت کی وہ مکروہ کشمکش نام کو بھی

نظر نہیں آتی ہے جس کا تذکرہ صفحات ماسبق میں کیا جا چکا ہے۔ فرد کی ذہانت نہایت سرعت کے ساتھ ترقی کرتی ہے اور جماعت اس میں مزاحم نہیں ہوتی بلکہ امداد دیتی ہے۔ اس لئے کہ وہ اس سے نفع اندوز ہوتی ہے اور انفرادی ترقیاں جماعتی ترقیوں کے مرادف ہو جاتی ہیں بلکہ انفرادیت و اجتماعیت کا اس طرح جدا گانہ اور علیحدہ علیحدہ یہاں وجود ہی نہیں رہتا بلکہ ایک ایسی معتدل اور پر امن و راحت فضا پیدا ہو جاتی ہے جس میں نوع انسانی انتہائی برق رفتاری کے ساتھ منازل ارتقا طے کرتی ہے اور اس کے اعلیٰ ترین مدارج پر جا پہنچتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ مندرجہ بالا نظریہ کی بنیاد پر چونکہ حقیقی مقصود نہ فرد ہوتا ہے نہ اجتماع اس لئے جذبات کے غلبہ سے بالاتر ہو کر صالح تمدن کا خالص عقلی فطری طریق اختیار کیا جاتا ہے یعنی صالح اجتماع کو وجود میں لانے کے لئے صالح افراد کو تیار کیا جاتا ہے۔ فرد کی تربیت اس انداز سے کی جاتی ہے اور اس کے افعال و اعمال نیز رجحانات کو ایسے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے کہ وہ فرد و جماعت کی قید سے بالاتر ہو جاتے ہیں اور ان کے منافع دونوں کے لئے یکساں اور مساوی ہو جاتے ہیں۔ اسلام جن افعال و افکار کی تعلیم انسان کو دیتا ہے (خواہ وہ تعلیم کسی درجہ میں کیوں نہ ہو) وہ جس طرح فرد کے لئے مفید ہوتی ہے اسی طرح جماعت کے لئے بھی مفید ہوتی ہے۔ ہر فرد اپنے کسی فعل سے جس طرح خود فائدہ اٹھاتا اسی طرح جماعت کو بھی فائدہ پہونچاتا ہے خواہ وہ اس فائدہ کو پہنچانے کا قصد بھی کرے یا نہ کرے۔

اخلاقی انقلاب

فرد و جماعت کے تعلقات کی جو توجیہ اسلام نے پیش کی ہے اس کی نظیر ملنا قطعاً محال ہے اور یہی وہ فطری اور صحیح بنیاد ہے جس پر کسی صالح تمدن اور صالح اجتماع کی تعمیر کی جا سکتی ہے جو اپنی افادیت اور استحکام میں آپ اپنی نظیر ہو سکتا ہے، اس لئے کہ اس کے ذریعہ سے وہ اخلاقی ماحول وجود میں آتا ہے جو افراد کی اخلاقی برتری و اصلاح اور ان کی بلند و برتر سیرت سے پیدا ہوتا ہے۔ اس اجتماع کے دواعی جذباتی اور نفسانی نہیں ہوتے بلکہ خالص عقلی و اخلاقی ہوتے ہیں، رحم، سخاوت، ایثار، توکل، قناعت، صبر، شکر، اخلاص، للہیت، مروت، عدل وغیرہ اخلاق حسنہ افراد کی زندگی کا جزو لاینفک بن کر منطقی طریق پر ایک اعلیٰ اجتماع کی جانب منتج ہوتے ہیں۔

اسلامی جماعت اور اسلامی فرد میں اس قدر گہرا تعلق ہے کہ جبتک خالصتہً اسلامی سیرت و اخلاق رکھنے والے افراد کا وجود نہ ہو اس وقت تک اسلامی جماعت کا تصور کرنا ہی عبث ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام اجتماعی انقلاب سے قبل انفرادی انقلاب پر زور دیتا ہے یعنی فرد کے اخلاق و عادات میں انقلاب پیدا کرنا چاہتا ہے اور اس کو اپنے پیش کردہ اخلاقی نظام کا پابند بنانا چاہتا ہے۔

سیاسی انقلاب

جیسا ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ اسلام کا فکری نظام جب خارج میں ظہور پذیر ہوتا ہے تو سب سے پہلے فرد کی زندگی میں انقلاب پیدا کرتا ہے۔ اور اس کے واسطے سے پھر وہ اجتماعی انقلاب برپا کرتا ہے اور اجتماعیت کا ایک نیا تصور، نیا نظام اور نئی ہیئت پیدا کرتا ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے ہمارے سامنے سیاسی انقلاب آتا ہے اس لئے کہ زندگی کا یہ شعبہ سب سے زیادہ عام اور موثر ہے اور اس کے حدود کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ تمدن کا قیام بغیر کسی سیاسی نظام کے محال ہے۔ اسی طرح دوسرے شعبہائے حیات کا بھی اس سے گہرا تعلق ہے اور اس کا دائرہ اثر سب پر حاوی ہے۔

نظریہ خلافت الٰہیہ

اسلام نے جو سیاسی نظریہ اور نظام پیش کیا ہے اس کے سمجھنے کے لئے پہلے مختصراً سیاست کے غیر اسلامی تصور کا بیان کر دینا ضروری ہے تاکہ دونوں کا فرق اچھی طرح واضح ہو جائے۔ ع

"فبضدها تتبین الاشیاءٗ"

ابتدائے آفرینش سے تا ایندم سیاست کے جتنے بھی غیر اسلامی نظریات و تصورات دنیا میں موجود رہے ہیں ان سب کا دار و مدار انسانی

حکومت و فرماں روائی کے تصور پر رہا ہے کہیں یہ انسانی فرماں جماعتی صورت میں نمودار ہوتی ہے اور کہیں انفرادی صورت میں بہرحال حاصل دونوں کا ایک ہے ـــــ جمہوریت، آمریت، شہنشاہیت وغیرہ سب اسی اصل کی فروع اور اسی کی مختلف شکلیں ہیں، یہ چیز بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ سیاست و اجتماع کے غیر اسلامی تصورات میں جہاں دیوتاؤں اور دیویوں کی فرماں برداری کے تصورات ملتے ہیں وہاں بھی درحقیقت انسانی فرمانبرداری ہی کا تصور حقیقی اور اصلی شے ہے۔ ان کا منشا ہرگز کسی غیر انسانی طاقت کی حکومت قائم کرنا نہیں ہے بلکہ انسانی اقتدار اعلیٰ کو ان وہمی مافوق الادراک اور مافوق النظر قوتوں سے تقویت دینا ان نظریات کا حقیقی مقصود ہوتا ہے تاکہ قانون کی پابندی اور اطاعت کے لئے افراد پر علاوہ جسمانی دباؤ کے ایک اخلاقی دباؤ بھی ڈالا جائے۔

نظریہ "خلافت الٰہیہ" ان کل سیاسی نظریات سے بالکل انوکھا ہے۔ چونکہ توحید کا عکس اور اس کا خارجی مظہر ہے اس لئے اس کی بنیاد اس تصور پر قائم ہے کہ سوا اللہ تعالیٰ کے کوئی فرماں روا اور مقتدر اعلیٰ (Sovereign) نہیں ہو سکتا۔ انسان یا غیر انسان کوئی بھی اس مرتبہ کی صلاحیت و طاقت نہیں رکھتا نہ کسی فرد یا جماعت کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ دوسرے فرد یا دوسری جماعت سے اپنی اطاعت و تابعداری کا مطالبہ کرے۔ یہاں تک کہ کسی مخلوق الٰہی کو اس کا بھی حق نہیں حاصل ہے کہ وہ خود اپنی ذات اپنے اعضاء اور اپنے جسم سے بھی اپنی اطاعت کا

طالب ہو، اطاعت کا مطالبہ صرف حق تعالیٰ جل شانہٗ کی طرف سے ہو سکتا ہے اور انھیں کو اس کا حق حاصل ہے۔

فطری آزادی

واقعہ صرف یہی نہیں ہے کہ انسان کو کسی دوسرے انسان سے اطاعت کے مطالبہ کا حق نہیں ہے بلکہ اس کو اس کا بھی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی ذات کو کسی دوسری مخلوق کا کلیتہً مطیع و منقاد بنا دے۔ اس لئے کہ ہر انسان فطرتاً آزاد ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ فطرتاً کسی مخلوق کی اطاعت و بندگی کے لئے نہیں پیدا کیا گیا ہے۔ فرد اور جماعت کی کشمکش اسی فطری آزادی کی رہین منت ہے۔ اگر وہ کسی مخلوق کا مطیع و منقاد ہو جاتا ہے تو وہ اپنی فطرت کی مخالفت کرتا ہے جو کسی صورت میں مناسب و مفید نہیں ہو سکتی۔ رواج کی پابندی، جمہور کی رائے کی پابندی، کسی شخص خاص کے حکم کی پابندی یہ سب پابندیاں انسان کی فطرت کے خلاف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان ہمیشہ ان کے خلاف بغاوت کرتا رہا ہے۔ گو ان بغاوتوں کی شکلیں مختلف ہوتی رہی ہیں۔ اگر اس کی فطرت میں یہ آزادی و حریت نہ ہوتی تو یہ بغاوتیں جو غیر فطری اور بیجا دباؤ کے خلاف وجود میں آتی رہی ہیں ہرگز ظاہر نہ ہوا کرتیں۔ ان بغاوتوں کی وجہ سے بنی نوع انسان اور ان کی ترقیوں کو جس قدر نقصانات پہونچتے ہیں وہ ظاہر ہیں۔ ان نقصانات سے بچنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ انسان کے اس فطری مطالبہ کو

دبانے اور کچلنے کے بجائے پورا کر دیا جائے اور نظام تمدن ایسا قائم کیا جائے جس میں اس کی پوری پوری رعایت ہو۔

فطری عبدیت

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان فطرتاً جس آزادی کا طالب ہے اس کی نوعیت کیا ہے۔ آیا انسان کی آزادی کا یہ مفہوم ہے کہ کسی قاعدے کا پابند ہی نہ ہو اور حیوانات کی طرح جس وقت جو خواہش ہو وہ کر ڈالے، ایسا کہنا قطعاً غلط ہے اس لئے کہ یہ تو آزادی نہیں ہے بلکہ خواہشوں کی غلامی و پابندی ہے انسان خواہشوں کے مجموعہ کا نام نہیں ہے، وہ اپنی خواہشوں پر بھی حاکم ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خواہشوں سے بالاتر اور ان کے ماسوا ہے بلکہ جیسا کہ ہم تمہید میں بھی ثابت کر چکے ہیں انسان فطرتاً قانون کی پابندی چاہتا ہے اس لئے اس کی آزادی کا یہ مفہوم تو ہرگز نہیں ہے کہ اس کی فطرت ہر پابندی کو قبول کرنے سے ابا کرتی ہے بلکہ اس کی حریت پسندی کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ وہ قانون اور اصول کی پابندی چاہتا ہے۔ ایسے قانون کی جو عقل خالص اور فطرت انسانی کے مطابق ہو مگر وہ اپنی جیسی مخلوق کی اطاعت و پابندی سے ابا و انکار کرتا ہے۔

خداوند تعالیٰ نے کل انسانوں کو ایک دوسرے کا فی الجملہ محتاج بنا دیا ہے ہر ایک کی حاجت دوسرے کے ساتھ وابستہ رکھی گئی ہے۔ ایک امیر ایک غریب کا اسی قدر محتاج ہوتا ہے جس قدر غریب امیر کا

ایک مدبر و عقلمند شخص بھی احمق کا اسی طرح محتاج ہے جس طرح ثانی الذکر اول الذکر کا۔ اس لئے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ انسان انسان کی پابندی کرے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ انسان کا یہ فطری مطالبۂ آزادی اسی صورت میں پورا کیا جا سکتا ہے کہ اس کو انسان کی پابندی اور اطاعت سے آزاد کر دیا جائے بلکہ اس کو ایک ایسے قانون کا پابند بنایا جائے جو خالق اور انسان کا وضع کیا ہوا ہو تاکہ اس کی فطری آزادی کے دونوں تقاضے صحیح طور پر پورے ہوں یعنی اطاعت مخلوق سے اباء و انکار، اور قانون حق کی پابندی کی رغبت جس کو ہم اس کی فطری عبدیت کہہ سکتے ہیں

قانون الٰہی

اسی طرح اقتضاء کی رعایت سے نظام خلافت کا دوسرا بنیادی اصول یہ مقرر کیا گیا ہے کہ انسان کے لئے صرف قانون الٰہی وہ "قانون حق" ہے جس پر عمل کرنا اس کے لئے ضروری و لابدی ہے۔ دنیا کی کوئی ہستی خواہ وہ کوئی فرد خاص ہو یا کوئی جماعت اپنے لئے یا دوسرے کے لئے کوئی قانون نہیں بنا سکتی اور نہ اس کی پابندی پر کسی کو مجبور کر سکتی ہے یہاں تک کہ وہ اپنی ذات کو بھی اللہ تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے قوانین کے علاوہ کسی دوسرے قانون کا پابند نہیں کر سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہم کو بنایا ہے اس لئے وہ ہماری فطرت اور اس کے رجحانات سے واقف ہیں۔ ہم خود اس سے واقف نہیں ہیں اس لئے

صرف انھیں کو اس امر کا حق ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارے لئے قانون وضع کریں انھیں کا وضع کیا ہوا قانون ہماری فطرت کے مطابق ہو سکتا ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے ابتداء آفرینش عالم سے اب تک کثیر تعداد میں اپنی کتابیں بھیجیں اور انبیاء کو مبعوث کیا تاکہ وہ دنیا کو اللہ تعالیٰ کے قانون سے آشنا بنا کر اس سے اس پر عمل کرائیں یہاں تک کہ اللہ کے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی آخری کتاب قرآن حکیم لے کر آئے انھوں نے اللہ کے مقرر کئے ہوئے قوانین کو نہ صرف علمی صورت میں بلکہ عملی شکل میں بھی پیش کر کے دنیا کو قیامت تک اس پر عمل کرنے کی دعوت دی۔

نظام خلافت میں قانون اسی اصول کا نام ہے جو قرآن مجید اور اسوۂ نبوی سے ماخوذ ہو۔ اس کے علاوہ اور کوئی شے قانون نہیں بن سکتی۔

قانون الٰہی پر عمل کر کے انسان خود کو آزاد محسوس کرتا ہے اس لئے کہ وہ محض قانون کا پابند ہوتا ہے نہ کہ کسی انسان کا بخلاف اس کے انسانی قانون پر عمل کر کے اس کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ مجھ سے کسی مجھ ہی جیسے انسان کی اطاعت بجبر کرائی جا رہی ہے۔ اول الذکر صورت میں اس کو جبر کا احساس نہیں ہوتا بلکہ ان قوانین پر عمل کرنے کے لئے وہ اپنے قلب میں داعیہ محسوس کرتا ہے۔ اس طرح اس کی فطری آزادی محفوظ رہتی ہے اور وہ حریت کی فضا میں سانس لیتا رہتا ہے۔

قیامِ عدل

قیامِ حکومت کا مقصد اگر ایک لفظ میں واضح کرنا ہو تو اس کے لئے

لفظ "عدل" غالباً موزوں تر ہوگا' انفرادی عدل اور جماعتی عدل دونوں
اس کے ذیل میں داخل ہیں یعنی فرد کے ذہنی و عملی قویٰ کو اس طرح تربیت
و نشوونما دینا کہ ان میں عدل پیدا ہو تاکہ فرد ایک ترقی یافتہ اور اعلیٰ درجہ کا
شہری بلکہ اعلیٰ درجہ کا انسان بن سکے۔ اور افراد کے درمیان باہم عدل و
انصاف کو قایم کرنا تاکہ نظام جماعت میں ابتری نہ پیدا ہو اور کل افراد ایک
دوسرے کی ترقی کے لئے مزاحم ہونے کے بجائے ایک دوسرے کے معاون
ہو جائیں اور ظلم و نا انصافی کا قلع قمع ہو کر مضبوط' پائدار' راحت افزا'
پر امن نظامِ تمدن و اجتماع قائم ہو جس کے قیام پر انسان کی تمامتر عقلی و
عملی ترقیوں کا دار مدار ہے حکومت کے اس مقصد وحید یعنی عدل کو حاصل
کرنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ انسان کی فطری آزادی کو سلب نہ کیا جائے
بلکہ اس کو قانون کا معاون بنایا جائے' اور اس کی صورت فقط یہی ہے کہ
قانون انسانی کو چھوڑ کر قانونِ الٰہی پر عمل کیا جائے۔ ورنہ انسانی قانون پر
عمل کرنے کے بعد انسان کے دل میں اس کے خلاف بغاوت کا جذبہ یقیناً
پیدا ہوگا جیسا کہ سطور ماسبق میں بہ تفصیل عرض کیا جا چکا ہے۔

عدل و انصاف کا قیام غیر اسلامی حکومت میں کیسے ہو سکتا ہے جب کہ
غیر اسلامی نقطۂ نظر سے حق کا مفہوم ہی متعین نہیں ہو سکتا۔

اسلامی نقطۂ نظر سے حق کا تعین قانون الٰہی سے ہوتا ہے اللہ تعالیٰ
کا قانون جس امر کو کسی کا حق قرار دے وہی اس کا حق ہے۔ اسلامی قانون
نے اس کی تعیین مکمل طور پر کردی ہے' یہاں تک کہ جانوروں تک کے

حقوق بیان کردئے ہیں۔ بخلاف اس کے غیر اسلامی اصول کے لحاظ سے حق کوئی متعین شے نہیں ہے بلکہ انسان کے تعین پر موقوف ہے۔ ہر انسان اس کا الگ تصور رکھ سکتا ہے لیکن جماعت کی طاقت جس کو حاصل ہو جاتی ہے اس کا تصور سب پر غالب ہو جاتا ہے۔ بہر حال چونکہ انسان خود ایک تغیر پذیر شے ہے۔ اس لئے اس کے وضع کردہ حق کا تصور بھی غیر متعین اور تغیر پذیر ہے اور ہونا چاہیئے پھر ایسی حالت میں عدل کا وجود کیسے ہو سکتا ہے جبکہ اس کی بنیاد ہی متزلزل ہے۔

بنیاد عدل کے اس تزلزل کا اقرار بھی ملاحظہ ہو۔ جان آسٹن اپنی کتاب جورس پروڈنس میں لکھتا ہے۔

"حقوق انسان کی پیدا کی ہوئی چیزیں ہیں۔ ان کا انحصار جماعت کے تسلیم کرنے پر ہے افراد کی قوت پر نہیں بلکہ معاملات کے حق و ناحق ہونے کے بارے میں جماعت کا جو اخلاقی تصور ہوتا ہے اس پر ان کا انحصار ہوتا ہے۔"

غیر اسلامی "عدل و انصاف" کے نمونے روزمرہ مشاہدے میں بھی آتے رہتے ہیں۔ غیر مہذب ہندوستان میں تو آپ نے دیکھا ہی ہوگا کہ یہاں کی عدالتیں ظلم و جبر و ناانصافی کے بدترین اڈے ہیں جہاں عدل و انصاف اور حق کو کند چھری سے ذبح کیا جاتا ہے لیکن "مہذب امریکہ" کا بھی ایک فیصلہ ذرا ملاحظہ ہو جس میں حق کا کیا اچھا مفہوم متعین کیا گیا ہے اور عدل و انصاف کی گردن پر کتنا بڑا احسان فرمایا گیا ہے۔ امریکہ کے چیف جسٹس

کینے نے اپنے ایک فیصلے میں لکھا ہے کہ

"حبشیوں کا کوئی ایسا حق نہیں ہے جس کا احترام سفید فام افراد پر واجب ہو۔"

لیجئے قصہ ختم ہوا ہی نہیں بلکہ تہذیب و انسانیت کے اسی دعویدار ملک (امریکہ) میں یہ قانون آج بھی رائج ہے کہ کوئی غیر سفید فام شخص شاہراہ پر نہیں چل سکتا تاکہ کہیں اس کا "ناپاک" بازو کسی "پاک" یورپین یا امریکن کے بازو سے نہ چھو جائے۔

یہ تو خیر غیروں کے ساتھ انصاف کی مثالیں ہیں لیکن خود امریکن امریکن کے ساتھ، جرمن جرمن کے ساتھ انگریز انگریز کے ساتھ کتنا انصاف کرتے ہیں؟ اس کی سبق آموز مثالیں بھی بکثرت ملیں گی۔ جن سے صاف طور پر معلوم ہوگا کہ ان صورتوں میں بھی عدل و انصاف کا کہیں پتہ نہیں چلتا ہے اور غریب امیر، قریب و بعید کے فروق کو ہر وقت پیش نظر رکھا جاتا ہے۔

خیر یہ داستان طویل ہے۔ حاصل یہ ہے کہ عدل و انصاف کا قیام بغیر قانون الٰہی کے نامکمل ہے۔ اس لئے خلافت الٰہیہ کا دوسرا بنیادی اصول قانون الٰہی اور محض قانون الٰہی کی پیروی کرنا ہے۔

نظام خلافت کے بعض خواص

مندرجہ بالا بیان سے نظام خلافت کے مندرجہ ذیل دو بنیادی اصول ظاہر ہوئے:۔

(۱) فرمانروا اور مقتدر اعلیٰ (Sovereign) صرف حق تعالیٰ جل شانہٗ ہیں۔

(۲) قانون وضع کرنے کا حق بھی صرف حق تعالیٰ کو ہے اور ہمارے لئے صرف حق تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے قوانین قابل عمل اور واجب العمل ہیں جن کا علم ہم کو قرآن مجید اور سیرت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔

اب ہم ان اصول کے بعض خواص اور اثرات کو ذکر کرتے ہیں کل خواص کا تذکرہ قریب قریب ناممکن ہے اس لئے کہ اس کے برکات و فوائد بے شمار ہیں۔

نوع انسان کی وحدت

فرماں رواؤں کی کثرت اور انسانی قانون سازی نے نوع انسانی کے ٹکڑے کر دئے ہیں۔ رنگ، نسل، وطن وغیرہ کے اختلافات نے اس کے اعضا کو جدا جدا کر کے اس کو ہزاروں حصوں میں تقسیم کر دیا ہے اور ایک حصہ کو دوسرے سے متنفر بنا دیا ہے۔ انگریز جرمن کا دشمن ہے اور جرمن انگریز کا فرانیسی اٹالین کا دشمن ہے اور اٹالین فرانیسی کا۔ زرد رنگ کو سفید سے عداوت ہے اور سفید کو زرد سے۔ غرض دنیا میں ہر قوم دوسری قوم سے متنفر ہے اور اس طرح امن و امان عالم غارت ہو رہا ہے۔ اسلام نے اس بناء فساد کو یکسر مٹا دیا ہے اس نے تخلیقی و تکوینی امر اور تشریعی فرمانروائی

دونوں کا مرکز ایک ہی ذات کو قرار دیا ہے پھر اس ذات کی فرماں روائی کو کل انسانوں کے لئے عام اور سب پر حاوی مانا ہے۔ اس لئے وہ نوع انسانی کی تقسیم نہیں کرتا ہے بلکہ وہ صرف فرماں روا کے عقیدے کی بنیاد پر سب انسانوں کو ایک ہی حاکم کا محکوم اور ایک ہی برادری کے ارکان قرار دیتا ہے اس کے نزدیک رومی و زنجی، انگریز و جرمن، ایرانی و ہندی، سفید و سیاہ اور زرد و سرخ میں کوئی فرق و امتیاز نہیں ہے۔ اور سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔

انسانوں کے مختلف احزاب اور گروہوں میں اگر فرق قائم ہوتا ہے تو وہ ان کے فکری، اخلاقی اور عملی رجحانات و امتیازات کی بناپر قائم ہوتا ہے۔ یہ فرق بالکل فطری ہے اور نہ عقل سلیم اس سے انکار کر سکتی ہے، نہ عملاً اس کا نظر انداز کر دینا ممکن ہی ہے ظاہر ہے کہ ایک چور کے ساتھ وہ برتاؤ نہیں کیا جا سکتا جو کسی دیانتدار شریف آدمی کے ساتھ کیا جاتا ہے، اسی طرح حکومت کے مخالف اور اس کے موافق کو بالکل ایک نظر سے دیکھنا ناممکن ہے ان فطری وجوہات کی بنا پر اسلام بھی ان فروق کو نظر انداز نہیں کرتا ہے بلکہ ان کو ایسی صورت دے دیتا ہے جس سے وہ بنی نوع انسان میں باہم منافرت پیدا کرنے کے بجائے محبت و اتحاد کا سبب بنجاتے ہیں اور دنیا کے لئے ایک رحمت و نعمت ثابت ہوتے ہیں۔

اسلام نے مسلم و ذمی کے درمیان جو فروق قائم کئے ہیں وہ اسی فطری فرق و امتیاز پر مبنی ہیں اور اس لئے بجائے تکلیف و پریشانی کے

مسلمانوں، ذمیوں اور تمام دنیا کے لئے امن وامان راحت واطمینان اور طرح طرح کی نعمتوں اور برکتوں کا سبب ہیں۔ اس مختصر مضمون میں ان اصول کی تشریح ناممکن ہے جو دونوں جماعتوں میں مابہ الامتیاز بنتے ہیں اشارۃً اتنا ہی کہدینا کافی ہے جتنا ہم کہہ چکے ہیں۔

عقلی ارتقا

خلافت الٰہیہ اور حکومت اسلامیہ کا قیام دنیا کی عقلی وعلمی ترقی کے لئے انتہائی ضروری اور غائت درجہ مفید ہے انسانی برادری کی تقسیم نے امن عالم کو غارت کر دیا ہے اور قوی کو ضعیف پر حاوی بنا دیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ضعیف کی ذہانت قوی کے ہاتھ میں گرفتار ہے اور وہ کوئی ترقی نہیں کر سکتی ہے ہندوستانی بھی اپنے علم اور اپنی عقل سے انسانی برادری کو کثیر فوائد سے بہرہ ور کر سکتا ہے لیکن اس کی ذہانت انگریزی پنجہ میں گرفتار ہے۔ یہی حال ان تمام اقوام کا ہے جو کسی طاقتور استعمار کے نیچے دبی ہوئی ہیں۔ الحاصل فرماں روائی کی کثرت اور رنگ ونسل وغیرہ کے امتیازات نے دنیا کی علمی وعقلی ترقی کو سخت نقصان پہونچایا ہے۔ اس لئے خلافت الٰہیہ کے قیام کے بعد جبکہ یہ قیود و پابندیاں دور ہو جائیں گی اور ذہن ودماغ کے یہ شکنجے ٹوٹ جائیں گے تو کل عالم انسانیت کی عقل وفہم ترقی کے اعلیٰ مدارج پر پہونچے گی دنیا کا عقلی وذہنی توازن اعتدال پر آکر ضلالت وگمراہی اور ظلم وطغیان کو

بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دے گا اور مختلف افراد و اقوام کی مختلف صلاحیتوں سے کل عالم انسانیت بہترین طریقہ پر بہرہ ور ہوگا۔

اسلامی حکومت کی خارجی شکل

نظریہ خلافت کی مختصر تشریح ہم سطور بالا میں کر چکے، اس نظریہ کی بنیاد پر اس کی جو خارجی شکل ظہور پذیر ہوئی ہے اس کا بھی ایک اجمالی خاکہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں تاکہ اس نظریہ کے سمجھنے میں سہولت ہو۔ اور پورا انتظام خلافت آسانی کے ساتھ سمجھ میں آسکے۔

جمہوری، شخصی یا نازی طرز ہائے حکومت سے اسلامی طرز حکومت بالکل جداگانہ شکل رکھتا ہے۔ اول الذکر طریقوں کے بالکل برعکس اسمیں ارباب حکومت درحقیقت ارباب حکومت کی حیثیت میں نہیں سمجھے جاتے ہیں اور ان کی یہی پوزیشن ان کے فرائض اور ذمہ داریوں کی بنیاد ہے۔ اس لئے اسلام کے نزدیک ان خدام کے انتخاب کا معیار ان کی صلاحیت کار ہے نہ کہ صرف کثرت آراء کی تائید بلکہ بلاشبہ انتخاب امیر کے معاملہ میں اکثریت کی رائے کو اسلام نے بھی وقعت دی ہے اس لئے کہ امیر حکومت اسلامیہ کا رکن اعظم بلکہ تنہا ذمہ دار افسر ہوتا ہے اور اس کے کام کی نوعیت ہی ایسی ہے جس کے لئے صلاحیت کار کے علاوہ قوت و طاقت کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو بغیر اکثریت کی تائید کے نہیں حاصل ہو سکتی نیز انقطاع وحی کے بعد صلاحیت کار کا فیصلہ بھی معاملہ فہم حضرات کی آراء ہی سے ہو سکتا ہے۔ غرض ان ہی وجوہ سے

امیر کے لئے انتخاب ضروری ہے۔ اہل حل وعقد کی اکثریت (جن میں معاملہ فہمی
کے علاوہ ایمان وعدالت اور خدا ترسی کا ہونا بھی شرط ہے) اس کو منتخب کرتی
ہے۔ لیکن اس کے بعد کل عہدہ داروں کے عزل ونصب کا اختیار امیر کو ہوتا
ہے اس کے لئے کسی انتخاب کی حاجت نہیں ہے۔ ہاں اگر پبلک میں سے
خواص اہل الرائے کی رائے بھی اس معاملہ میں دریافت کر لی جائے تو اس
میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے سنت فاروقیؓ میں اس کی نظیر بھی ملتی ہے لیکن
پھر بھی امیر پبلک کی رائے کا پابند نہیں ہے۔

امیر حکومت اسلامیہ کا واحد انتظامی افسر ہوتا ہے (executive
officer) وہ تنہا حکومت کے کل محکموں کا نگران اور ناظم ہوتا ہے
اور حکومت کے پورے نظام کو چلانے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس طریقہ سے
اس اجتماع میں مرکزی وحدت پیدا ہوتی ہے جو اجتماع کی سب قوتوں کو ایک
نقطہ پر جمع کر کے اس میں استحکام وطاقت پیدا کر دیتی ہے جو کسی اور نظام
حکومت میں نہیں پائی جا سکتی۔ پھر یہ مرکز نہ تو جمہوریت کی طرح متزلزل ہوتا
ہے اور نہ نازیت کی طرح جامد بلکہ اس میں پائداری کے ساتھ حرکت ہوتی ہے
مگر ایسی حرکت جس کا رخ ارتقا کی طرف ہوتا ہے اور جس میں استقلال وثبات
ومضبوطی وقوت کے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔ اس معتدل صورت کا سبب
یہی ہے کہ حکومت کے انتظامی معاملات تو کل کے کل ایک شخص یعنی امیر کے
ہاتھ میں ہوتے ہیں لیکن اس کو وضع قانون (Legislature) کا
کوئی حق نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اپنی اور کل ممبران جماعت کی ذہانت

وعقل کو دوسروں کی اور اپنی خواہشات کی تکمیل میں صرف کرنے کے بجائے
اللہ تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے قوانین سے فائدہ اٹھانے میں صرف کرتا
رہتا ہے ایسے قوانین جو انسان وانسانیت کی ترقی وعروج کے لئے بہترین
معاون ومددگار ہیں۔

مجلس شوریٰ کی حیثیت امیر کے بعد ہے جس کا انتخاب امیر کرتا ہے
اور جو امیر کو مشورہ دیتی ہے اور اس کے افعال وحرکات کی نگرانی کرتی ہے۔
امیر کے انتخاب کے لئے شرط اولین علم اور تقویٰ ہے بغیر ان اوصاف
کے کوئی امیر امارت کی صلاحیت ہی نہیں رکھ سکتا نہ اس کا انتخاب جائز کہا
جا سکتا ہے خواہ اس کو اکثریت کی تائید ہی کیوں نہ حاصل ہو۔ ان مسائل
کی زیادہ تفصیل اس موقعہ پر غیر ممکن ہے۔

امثلہ وفروغ

نظام خلافت کے قیام کے بعد ہمارے روزمرہ کے مسائل میں کیا
تغیرات پیدا ہوں گے اور دنیا کے موجودہ مسائل کا حل کس صورت سے
ہو جائے گا۔ اس کی چند مثالیں بھی ہم ذیل میں درج کرتے ہیں تاکہ ناظرین
کے لئے اس نظام کا سمجھنا آسان تر ہو جائے اور ان کو معلوم
ہو جائے کہ ہماری موجودہ زندگی پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے۔

• نظام خلافت کے قیام سے ہمارے سیاسی حالات میں صرف تغیر ہی
نہ ہوگا بلکہ مکمل انقلاب پیدا ہو جائے گا اور وہ جڑ سے لیکر چوٹی تک یکسر

بدل جائیں گے۔ اور عالم میں ایک نئی زندگی کے آثار دکھائی دینے لگیں گے
ان انقلابات کی چند مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:۔

قیام خلافت کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں اول یہ کہ کل دنیا خلافت الٰہیہ کے ماتحت ہو جائے۔ دوم یہ کہ کسی خاص ملک اور کسی خاص حلقہ میں اس کا قیام ہو۔

پہلی صورت میں پیدا ہونے والے ذیل کے خاص انقلابات بطور مشتے نمونہ از خروارے ذکر کیے جاتے ہیں۔

(۱) رنگ، نسل اور وطن وغیرہ کے امتیازات اٹھ جائیں گے اور تمام عالم ایک ہی ریاست کے ماتحت ہو جائیگا یہ عالمگیر حکومت (Universal State) ہر ملک اور ہر قوم بلکہ ہر فرد سے یکساں تعلق رکھے گی۔ ہر ایک کے مفاد کا یکساں لحاظ کریگی اور قومیت (Nationalism) وطنیت (Patriotism) کے مہلک تعصبات سے بالاتر ہوگی۔

(۲) قدرت کے خزانوں سے چونکہ کل انسان یکساں فائدہ حاصل کرینگے اور اپنی صلاحیتوں کے بغیر مساوی فوائد حاصل کرینگے اس لئے بین الاقوامی اور بین الممالکی رشک و رقابت کا وجود نہ ہوگا اس لئے جنگ کا قطعی طور پر سد باب ہو جائے گا اور ایک دائمی امن و امان قائم ہو جائیگا جس میں انسانیت و تمدن بیش از بیش ترقی کر سکے گا۔

(۳) معاشی سطح ہموار ہونے کی وجہ سے سرمایہ داری و غریبی کی کشمکش مفقود ہو جائیگی اور ہر شخص راحت و اطمینان سے ہمکنار ہو گا۔

(۴) آزاد تجارت کی وجہ سے ہر ملک کو اس کی ضروریات بآسانی میسر آسکیں گی۔

(۵) ہر ملک دوسرے ملک کا اور ہر قوم دوسری قوم کا خون چوسنے کے بجائے ترقی و عروج میں معاون و مددگار رہوں گے۔

(۶) کل انسانوں میں محبت، خلوص، ہمدردی اور دوسرے اعلیٰ اخلاق و عادات اور تقویٰ و پاکیزگی کو ترقی ہوگی اور بدکرداریاں، ظلم و ستم، بدیانتی اور دیگر بداخلاقیاں اپنی موت آپ مر جائیں گی۔

دوسری صورت میں ہم مثلاً ہندوستان ہی کو نظام خلافت کے ماتحت فرض کرکے نتائج کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔

(۱) قریب قریب مندرجہ بالا تمام امور کا ظہور ہوگا۔

(۲) قومی و ملکی حکومت کا قصہ ختم ہو جائے گا، بلکہ اللہ کی حکومت کے اصول پر پورے ہندوستان کا ایک نظامِ حکومت ہوگا۔

(۳) ہندو مسلم مناقشات ختم ہو جائیں گے کیونکہ یہ سب نظریۂ قومیت کے نتائج ہیں اسی کے ساتھ نشستوں وغیرہ کے جھگڑے بھی ختم ہو جائیں گے فیڈریشن وغیرہ کا بھی کوئی قصہ باقی نہ رہے گا کیونکہ یہ سب کچھ "قومیت" ہی کے شاخسانے ہیں۔

(۴) والیان ملک کے مظالم اور ان کی عیاشیوں سے جو مصائب اہل ہندوستان بالخصوص مسلمانوں کو برداشت کرنا پڑ رہے ہیں ان سے نجات ہو جائے گی اس لئے کہ اللہ کے زیر حکومت ملک میں خود "والیان ملک" کا وجود ہی نہ رہیگا۔

(۵) نوابوں، تعلقہ داروں اور بڑے بڑے زمینداروں کے اقتدار سے عام پبلک کو چھٹکارا نصیب ہو جائیگا اس لئے کہ یہ سسٹم ہی ٹوٹ جائے گا۔

(۶) موجودہ نظام تعلیم جو طلبہ اور ان کے سرپرستوں کیلئے سراسر غیر مفید بلکہ انتہائی مضرت رساں و مہلک ہے ختم ہو کر ایک ایسا نظام تعلیم اس کی جگہ رائج کیا جائے گا جو ہر انسان کے لئے انتہائی مفید ہو گا۔

(۷) اچھوت غیر اچھوت اور شریف و رذیل کی تقسیمیں مٹ جائیں گی بلا امتیاز نسل و رنگ ہر بھلے انسان کی عزت کی جائے گی اور اس کو دوسرے انسانوں کا بھائی سمجھا جائے گا۔

(۸) عدل و انصاف کا دور دورہ اور قانونی مساوات کا رواج ہو گا رشوت ستانی، ظلم، ناانصافی، قانونی نامساوات اور اسی قسم کی دوسری چیزیں جن کا آج دور دورہ ہے قطعاً نیست و نابود ہو جائیں گی۔

(۹) انصاف و تعلیم دونوں چیزیں مفت اور بلامعاوضہ ہوں گی۔

(۱۰) قانون چونکہ انسان کا وضع کیا ہوا نہ ہو گا بلکہ اللہ تعالیٰ کا مقرر کیا ہوا ہو گا یعنی قرآن مجید اور سیرت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے ماخوذ ہو گا اس لئے صاف، مستقل، مضبوط اور کل جزئیات و ضروریات پر حاوی ہو گا اور اس میں انسان کے ساختہ اور مروجہ قانون کی طرح وہ لوچ نہ ہو گا جو بد دیانتی، بے ایمانی، اور ظلم کی بہت زیادہ گنجائش اپنے اندر رکھتا ہے نہ وہ مروجہ قانون کی طرح ناقص و نامکمل ہو گا۔

(۱۱) حکام، حکمران و مخدوم نہیں بلکہ پبلک کے خدام سمجھے جائیں گے اور عہدوں کے خواہشمندوں کو کوئی عہدہ نہیں دیا جائے گا۔

(۱۲) بداخلاقیوں اور ان کے اسباب کو نیست و نابود کر دیا جائے گا

اور پبلک کی اخلاقی اصلاح و تربیت کی ذمہ دار بھی حکومت ہوگی۔

(۱۳) پبلک کا ہر پہلا فرد حکومت کی مشنری کا ایک پرزہ اور ان کا ایک فرد ہوگا وہ سوا خدا کے کسی کا محکوم نہ ہوگا اور اس کو فطری آزادی میسر ہوگی۔

(۱۴) ٹیکسوں کی بھرمار سے غریب پبلک کا خون چوسنے والا کوئی نہ ہوگا۔

(۱۵) ملک میں ہر طرف کامل امن وامان ہوگا۔

نمونہ کے طور پر مندرجہ بالا چند تغیرات کا ذکر کافی ہے جس سے نظام خلافت کے اثرات کا ایک اجمالی خاکہ ناظرین کے ذہن میں آجائے ورنہ اس کے برکات تو بے حد و بے شمار ہیں جو اسی وقت صحیح طور پر سمجھ میں آسکتے ہیں جب نظام خلافت قائم ہوجائے اور وہ عملاً ظاہر ہونے لگیں۔ عملی مثال کے طور پر ہم دور نبوی اور دور خلافت راشدہ کو نیز حضرت عمر بن عبدالعزیز رح کے دور کو پیش کر سکتے ہیں۔

معاشی انقلاب

اسی نظام خلافت کا ایک جزو اور اسلام کے فکری و اخلاقی نظام کا ایک خارجی مظہر وہ معاشی نظام ہے جو اسلام پیش کرتا ہے۔ دنیا میں آج دو قسم کے معاشی نظام رائج ہیں۔ ایک سرمایہ داری (Capitalism) دوسرا اشتراکیت (Socialism) ان دونوں کو دنیا نے ناقص اور مضر پایا ہے اور دونوں آج کل موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ اور درحقیقت روح ان دونوں کی ایک ہی ہے نظام سرمایہ داری میں سرمایہ دار بکثرت ہوتے ہیں اور نظام اشتراکیت میں کثیر التعداد سرمایہ داروں کو مٹا کر ایک سرمایہ دار

بت بنایا جاتا ہے جس کو "حکومت" کہتے ہیں۔ انسان کی فطری آزادی اور اس کی ترقی کی جبلی صلاحیتوں کو دونوں میں یکساں طور پر پامال کیا جاتا ہے اور دونوں میں یکساں طور پر ظلم و جبر کی حکومت ہوتی ہے۔

یہاں ہم کو ان معاشی نظریات پر تنقید منظور نہیں ہے اس سے پیشتر اپنے بعض مضامین میں اشتراکیت پر بھی تنقید کر چکا ہوں، نظام سرمایہ داری اب آپ اپنی موت مر رہا ہے اور دنیا کی نظروں میں ملعون ہو چکا ہے، اس لئے یہاں صرف اس قدر بتانا چاہتا ہوں کہ اسلام نے انسان کی معاشی زندگی کی ایک بالکل انوکھی راہ نکالی ہے جو سب سے جداگانہ ہے اسلام کے انھیں معاشی اصول کا اجمالی تذکرہ یہاں مدنظر ہے۔

معاشیات کی بنیاد ذرائع پیدائش Means of Production کی ملکیت کے مسئلہ پر قائم ہے اگر یہ حل ہو جاتا ہے تو معاشیات کے دوسرے مسائل کا حل ایک حد تک آسان ہو جاتا ہے۔

نظام سرمایہ داری میں تو ان ذرائع کا مالک فرد کو تسلیم کیا جاتا ہے اور اشتراکیت ان کو جماعت کی ملکیت قرار دیتی ہے لیکن اسلام ان دونوں سے الگ ایک راہ نکالتا ہے وہ نہ فرد کو ان کا مالک تسلیم کرتا ہے نہ جماعت کو بلکہ "قانون" (یعنی قانون الٰہی) کو ان کا مالک قرار دیتا ہے، انسان کسی شئے کا مالک نہیں ہے یہاں تک کہ اپنی جان کا بھی مالک نہیں ہے وہ اللہ کا بندہ اور مملوک ہے اور صرف اسی کے مقرر کئے ہوئے قوانین کے مطابق وہ دولت اور اس کے ذرائع میں تصرف کر سکتا ہے اس طرح دولت کی

پیدائش تقسیم اور اس کا صرف[1] تینوں امور اسلامی قانون اور اس کے واسطے سے اسلامی حکومت کے زیر نگرانی رہتے ہیں اور انسان کی پوری معاشی جدوجہد اس کی فطری آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے بھی اس قدر آزاد نہیں ہونے پاتی کہ وہ فرد یا جماعت کیلئے مضرت رساں ہو جائے۔ اور اس میں سرمایہ داری وقارونیت کو نشوونما حاصل کرنے کا موقع مل جائے۔ اس فطری آزادی کو برقرار رکھنے کی وجہ سے فرد کی معاشی جدوجہد اپنے داخلی جذبات اور عقلی مصالح کی بناء پر ہوتی ہے نہ کہ خارجی جبر واستبداد کی بناء پر' اس لئے معاشی ترقی دن دونی رات چوگنی ہوتی رہتی ہے اور اس معاشی ترقی میں ہر فرد بلکہ کل عالم انسانیت کا حصہ ہوتا ہے۔ نظام سرمایہ داری کی طرح چند افراد دولت کے اجارہ دار نہیں بن سکتے بلکہ کل افراد میں فطری قسم کی معاشی مساوات پیدا ہو جاتی ہے' اس کے بعد جو معاشی فروق ہوتے ہیں وہ صرف افراد کی ذاتی صلاحیتوں کے تفاوت کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں جن کا نظر انداز کر دینا فطرت سے جنگ کرنا ہے یا پھر جدوجہد کی کمی بیشی اس فرق کو پیدا کرتی ہے جس کا لحاظ نہ کرنا عدل وانصاف کا خون کرنا ہے تاہم ضروریات حیات ہر شخص کو یکساں میسر آتی ہیں جس کی بہم رسانی کی حکومت اسلامی بھی اسی قدر ذمہ دار ہوتی ہے جس قدر خود ضرورت مند۔ یہاں تک کہ اس میں ان لوگوں کا بھی حصہ ہوتا ہے جو اس جدوجہد میں حصہ لینے سے معذور ہیں۔ اس حصہ دینے پر ہر دولتمند مجبور ہے۔ اس طرح دولت ایک جگہ مجتمع نہیں

---

[1] Production, Distribution, Consumption

ہو سکتی بلکہ ہر وہ شخص جو دولت کمائے اس کو گردش دینے اور صرف کر دینے پر مجبور ہے۔ اور اگر وہ اپنی خواہش کی بنا پر اس کو صرف نہ کرے گا تو حکومت اس کو اس کے لئے مجبور کرے گی۔ چنانچہ نظام زکوٰۃ، عشر اور ادا حقوق کے ذریعہ سے اسلام ہر مجتمع دولت کو پھیلا دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد "قارون" کوئی نہیں رہ سکتا اور آسودہ حال ہر شخص ہو جاتا ہے اور پھر ہر طرف راحت و اطمینان کا دور دورہ ہوتا ہے۔

اسلامی نظام معاشی کی بنیاد چونکہ اخلاقی ہے اس لئے اس میں سرمایہ داری و قارونیت کے جراثیم پیدا ہی نہیں ہو سکتے بلکہ اس فضاء میں آتے ہی موت کے گھاٹ اتر جاتے ہیں۔ اس لئے یہ نظام خود مستقل ہوتا ہے اور اس کے قیام و بقا کیلئے اشتراکیت کی طرح کسی آہنی اور ظالمانہ حکومت کی گرفت ضروری نہیں ہوتی ہے بلکہ جماعت کی اخلاقی طاقت اس کو خود بخود زندہ رکھتی ہے۔

امثلہ

مندرجہ بالا بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی معاشیات کے بنیادی اصول یہ ہیں:

(۱) دولت اور اس کے ذرائع کا مالک اللہ تعالیٰ کا مقرر کیا ہوا قانون ہے کسی فرد یا جماعت کو حق ملکیت حاصل نہیں ہے۔

(۲) انسان دولت اور اس کے ذرائع میں صرف وہی تصرف کر سکتا ہے جس کی اجازت اس کو قانون الٰہی دیتا ہے۔

(۳) قانون الٰہی کے مطابق دولت کا صرف کرنا ہر دولتمند کیلئے ضروری ہے۔

اسلام کے معاشی نظام کے تین بڑے اصول یہی ہیں ' بقیہ اصول و قوانین کا بیان ایک ضخیم کتاب کا محتاج ہے اس لئے ان کو بیان کرنے کے بعد اب ہم ذیل میں چند روزمرہ کے مسائل کے متعلق یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ان میں اسلامی نظام معاشی کے قیام کے بعد کیا تغیرات رونما ہوں گے۔

اس نظام کے رواج کی بھی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اول یہ کہ اس کا رواج پوری دنیا میں ہو دوسرے یہ کہ اس کا رواج کسی ایک ملک مثلاً ہندوستان میں ہو۔

اول الذکر صورت کے چند ظاہری تغیرات نمونتہً درج ذیل ہیں:۔

(۱) تمام ممالک اور اقوام کے مابین آزاد تجارت ہوگی' ہر ملک دنیا کی تمام نعمتوں سے بہرہ ور ہو سکے گا اور دوسرے ملک کی ترقی میں مانع ہونے کے بجائے معاون ہوگا۔

(۲) مبادلہ عموماً بطریق تولیہ [ع] ہوگا یعنی دولت پیدا کرنے کے لئے نہ ہوگا بلکہ دولت سے فائدہ اٹھانے کیلئے ہوگا۔ اس طرح دولت کسی ایک ملک کے پاس جمع نہ ہو سکے گی بلکہ دنیا میں مساوی طور پر تقسیم ہو کر اس کے معاشی توازن کو صحیح حالت میں رکھے گی۔

(۳) دنیا میں کسی بڑے سرمایہ دار کا وجود نہ ہوگا۔

(۴) مزدوروں کی کل شکایتیں دور ہو جائیں گی وہ نہایت آرام و

ع تولیہ "فقہ اسلامی" کی اصطلاح ہے اس کے معنی ہیں کسی شئے کو اس کی اصل قیمت خرید پر بغیر نفع کے فروخت کرنا۔

آسائش سے بسر کریں گے اور ان کی محنت کی صحیح قدر و قیمت پہچانی جائیگی۔

(۵) مزدوروں اور محنت کشوں کی جان، آبرو، مال، صحت اور تندرستی کے تحفظ کا انتظام حکومت اسلامیہ کی جانب سے ہوگا۔

(۶) مزدوری پر جبر نہیں کیا جاسکے گا

(۷) معاشی رشک و رقابت کا وجود نہ ہوگا اس لئے جنگ و خونریزی قریب قریب مفقود ہو جائے گی۔

(۸) ہر ملک کے افراد دنیا کے ہر سمندر میں آزادانہ جہازرانی کر سکیں گے۔

(۹) طبقاتی جنگ ختم ہو جائے گی اس لیے کہ مختلف طبقات کو ایک دوسرے سے کوئی شکایت ہی نہ رہے گی۔

(۱۰) سودخواری، مہاجنی اور سودی قسم کے کل کاروبار بند ہو جائیں گے۔

(۱۱) دنیا کا کوئی فرد ایسا نہ ہوگا جس کو اس کی ضروریات زندگی میسر نہ آئیں۔

(۱۲) چونکہ زمین پر کسی ایک ملک کا قبضہ نہ ہوگا اور قیمت بھی بہ آسانی ایک ملک سے دوسرے ملک میں منتقل کی جاسکے گی اس لئے دنیا کی پیداوار میں بہت اضافہ ہو جائے گا اور ہر ملک کو اس کی ضرورت کی چیزیں بافراط میسر آسکیں گی[1] اور ہر فرد اطمینان و فارغ البالی کی زندگی بسر کرے گا۔

(۱۳) حکومتوں کا انتخاب پروپیگنڈے اور رشوت کی قوت سے نہ ہوگا۔

---

[1] چند سال کا واقعہ ہے کہ امریکہ میں گندم کی پیداوار بہت ہوئی جس کو محض اس خیال سے جلا دیا گیا کہ افراط کی وجہ سے اس کی قیمت کم وصول ہوگی۔ یہ حیوانیت نہیں تو اور کیا ہے — اللہ اللہ ان خونخوار درندوں کو بھی ...... آج انسانیت کا دعوے ہے، یہ ہیں نظام سرمایہ داری کی برکات ۱۲ منہ،

جو سرمایہ داری کیلئے لازمی ہے بلکہ پبلک کی آزاد رائے اور خواہش کی بنا پر ہوگا اور حکومتیں صحیح معنی میں پبلک کی نمائندگی کرینگی۔

(۴) اشتراکیت کی طرح پبلک پر کوئی جابر و قاہر حکومت مسلط نہ ہوگی جو افراد کو بے جان مشین کے پرزوں کی طرح سمجھتی ہو بلکہ ایسی حکومت قائم ہوگی جس کے ساتھ پبلک کو دلی ہمدردی ہوگی اور جو ان کی ہمدرد اور ان کی عقل و فہم کو ترقی دینے میں معاون ہوگی۔

نمونتہً اتنے نتائج کا تذکرہ کافی ہے ورنہ اس کے برکات بھی بیشمار ہیں ثانی الذکر صورت میں (یعنی جب یہ نظام صرف ایک ملک مثلاً ہندوستان ہی میں رائج ہو) مندرجہ ذیل نتائج نمونتہً پیش کئے جاسکتے ہیں:-

(۱) مندرجہ بالا نتائج میں سے بھی اکثر کا یہاں ظہور ہوگا۔

(۲) موجودہ تعلقہ داری و زمینداری سسٹم ختم ہو جائے گا۔

(۳) مہاجنی وغیرہ کے سب طریقے ختم کر کے سودخواری کا ہر ذریعہ مسدود کر دیا جائے گا۔

(۴) قماربازی، سٹہ بازی، لاٹری وغیرہ آمدنی کے غلط ذرائع ممنوع قرار دئے جائیں گے۔

(۵) مزدوروں کی اجرت ان کی محنت کی صحیح قدر کے اعتبار سے مقرر کی جائے گی اور کارخانہ داروں کو ان کی احتیاج سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا موقع نہ دیا جائے گا۔

(۶) رفتہ رفتہ سرمایہ داری کو ختم کر دیا جائے گا۔ اور پھر ملک میں

کسی لکھ پتی ہو کروڑ پتی کا وجود نہ رہے گا۔ بلکہ قریب قریب سب اہل ملک معاشی حیثیت سے مساوی درجہ پر آجائیں گے۔

(۷) کاشتکاروں کی مصیبتوں کو دفع کیا جائے گا اور ان کو زمینداروں اور تعلقہ داروں کی گرفت سے آزاد کیا جائے گا ان کی حیثیت زمیندار کے ساتھ محض ایک مساوی شریک کاروبار کی ہوگی نہ کہ "آسامی" کی یہ اس وقت تک کیلئے جب تک زمینداری سسٹم ختم نہ ہو جائے لیکن جب رفتہ رفتہ وہ ختم ہو جائے گا اس کی بھی حاجت نہ ہوگی۔

(۸) بعض مقامات میں محض رسم و رواج کی بناء پر لڑکیوں کو وراثت سے محروم رکھا جاتا ہے۔ اس ظلم کو مٹایا جائے گا اور لڑکیوں کے حقوق دلائے جائیں گے۔

(۹) ہر شخص معاشی حیثیت سے خوشحال و مرفہ الحال ہوگا۔ اور ملک میں کوئی بھی بھوکا ننگا نہ رہے گا۔ افلاس کا کہیں وجود نہ ہوگا۔

(۱۰) کنز (یعنی ایسا مال جس پر اسلام کا مقرر کیا ہوا الٰہی ٹیکس نہ ادا کیا گیا ہو) کی سخت ممانعت ہوگی اور صاحب نصاب سے اسلامی محاصل مثلاً زکوٰۃ و عشر وصول کر کے معذور اور ضرورتمند لوگوں کو تقسیم کر دئے جائیں گے۔

(۱۱) کوئی شخص کسی سے بیگار نہ لے سکے گا نہ کوئی جبریہ خدمت کرا سکے گا۔

(۱۲) حکومت خود تاجر اور سرمایہ دار نہ ہوگی بلکہ تمام ملک کے

سرمایہ اور تجارت پر احتساب اور کنٹرول قائم رکھے گی۔

(۱۳) زر کی حیثیت محض آلہ مبادلہ کی ہوگی اس کو مقصود و مطلوب نہ سمجھا جائے گا۔

نمونتہً ان تیرہ نتائج پر ہی اکتفا کرتا ہوں ورنہ اسلامی نظام معاشی کے بھی برکات بے شمار ہیں۔

دعوت فکر و عمل

حضرات! یہ ہے اس اسلامی نظام کا مختصر خاکہ جس کا قائم کرنا ہمارا دینی فرض، پیدائشی حق، فطری نصب العین اور حقیقی مقصد ہے۔ اس نصب العین کے حصول کے لئے دنیا کی بیش قیمت سے بیش قیمت چیز کا قربان کر دینا یہاں تک کہ جان و آبرو سے ہاتھ دھونا بھی کوئی اہم شے نہیں ہے اور ان اصول کے زندہ کرنے کیلئے اگر تمام دنیا کے مسلمان بھی مر جائیں تو بھی اس سودے کو ارزاں ہی کہا جائے گا۔ اس لئے کہ مسلم کی حقیقی زندگی اسلامی اصول کی زندگی سے وابستہ ہے نہ کہ افراد کی زندگی سے پھر اس نظام کی طرف دعوت دینے اور اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے یہ وقت بھی موزوں ترین ہے اس لئے کہ دنیا خود ساختہ سارے غلط نظاموں کا تجربہ کر کے سب کو ناقص اور مہلک پا چکی ہے بس ضرورت ہے خود ہمارے ہی عزم و ہمت اور مسلسل جد و جہد و قربانی کی۔ اگر ایک مختصر سا صالح گروہ بھی ہمت مردانہ سے

کام لے اور محیای ومماتی للہ رب العالمین کہہ کے میدان جدوجہد میں کود پڑے تو اللہ پاک کی نصرت وتائید ہمارے ساتھ ہوگی۔ اس کا وعدہ ہے ولینصرن اللہ من ینصرہٗ ان اللہ قوی عزیز ہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اس خاص وقت سے فائدہ نہ اٹھانا اور قدرت کے پیدا کئے ہوئے اس موقع کو کھو دینا ایسی غلطی ہوگی جس کی تلافی شاید ہم کبھی نہ کرسکیں گے اور زمانہ ہماری اس مجرمانہ غفلت کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔ جو قومیں "وقت" سے فائدہ اٹھانا نہیں چاہتیں ان کیلئے موت وہلاکت کے سوا کوئی چیز نہیں ہوتی۔

علمائے سے خاص گزارش

کاش میری یہ کمزور آواز میرے مخدوم ان علمائے کرام تک بھی پہونچ سکے جو بیس سال سے اپنا سارا وقت اور ساری قوتیں ہندوستان کی . . . دستوری سیاست میں ضائع کر رہے ہیں اور اس کا نتیجہ ان کو ابھی تک اس کے سوا کچھ نہیں ملا ہے کہ انھوں نے اس رویہ سے اپنے پرانے حریفوں کے ہاتھ قوی کردئے ہیں، اور اب وہ لوگ اسلام کا نام لیکر عوام مسلمین میں ان کے خلاف بے اعتمادی پھیلا رہے ہیں جن کو اسلام سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے اور اپنے اس حربہ میں کامیاب بھی ہو رہے ہیں ــــ تو اگر علماء کرام دستوری سیاست کے ان بکھیڑوں کو چھوڑ کر جو آپ اپنی موت مر رہے ہیں اس اصولی انقلابی سیاست کو۔

دستور بنالیں، اور "کلچرل آٹانومی" "تحفظ حقوق اور" پرسنل لا" کے ان لغو مطالبوں کے بجائے جن کی آج کل انقلابی دنیا میں کوئی قیمت نہیں رہی ہے، حکومت الہیہ کی اقامت اور" اسلامی نظام" کے بروئے کار لانے کے لئے اپنی جدوجہد مخصوص کردیں، جو ایک مستقل ذہنی فریضہ ہونے کے علاوہ وقت کی خاص پکار بھی ہے، اور دنیا اس وقت اس کی شدید ترین حاجتمند بھی ہے تو علاوہ اور امور کے اس کا سب سے پہلا اثر یہ ہوگا کہ دین و دیانت سے محروم جو غرض پرست گروہ اس وقت منافقانہ طور پر اسلام کا نام استعمال کر رہا ہے وہ اپنا لباسِ نفاق اتار کر عریاں ہو جانے پر مجبور ہو جائے گا اور بہت سے بندگان خدا جو اس دام فریب میں پھنس رہے ہیں وہ گمراہی اور غلط روی سے بچ جائیں گے اور خود آپ اپنے مولا کے سامنے سرخرو ہو کر جانے کے قابل ہو جائیں گے، ورنہ یقیناً جوابدہی کرنی پڑے گی آپ کو اس بازپرس کی کہ جبکہ دنیا میں" اصول حیات" کی کشمکش ہو رہی تھی، نازیت پر ایمان رکھنے والے اپنے نازی ازم کو دنیا کے سامنے پیش کر رہے تھے، "جمہوریت" کے پجاری اس کے حفظ و بقا کے لئے جدوجہد کر رہے تھے، اشتراکی اپنی اشتراکیت کے لئے کٹ مر رہے تھے اور دنیا ایک صالح اور امن و راحت کے کفیل نظام کی ضرورت مند تھی تو اس وقت تمہارے مشاغل کیا تھے؟ اور میرے بھیجے ہوئے اسی "اسلامی نظام" کیلئے جس پر ایمان رکھنے کا تم کو دعویٰ تھا، تم کیا کر رہے تھے؟

پس اے علماء کرام! اے دین اسلام کے حاملو اور حامیو! اے

کتاب وسنت سے شغف رکھنے اور ان کا درس دینے والو! اے اصحاب فتویٰ و ارباب ارشاد!! وقت کو پہچانو' اس کی پکار سنو! خدا کیلئے اٹھو! اس کا نام لے کر اٹھو اور شر و فساد کی طرف سے خیر و صلاح کی طرف دنیا کا رخ پھیر دینے کیلئے کمر ہمت باندھ لو!

اس جدوجہد کا پہلا حصہ جس کیلئے اس وقت کوئی رکاوٹ نہیں ہے اور جو آپ ہی کے کرنے کا کام ہے۔ یہ ہے کہ "اسلامی نظام" کی بے پناہ اور مسلسل و مدلل تبلیغ کی جائے اور وقت کے تمام جائز اور جدید ذرائع تبلیغ کو استعمال کیا جائے یہ تبلیغ منظم ہو اور ایک تحریک کی شکل میں ہو۔ پہلے اس تبلیغ کے ذریعہ خود مسلمانوں میں اور دوسروں میں بھی فکری انقلاب پیدا کیا جائے' استدلال اور معقولیت کے ہتھیاروں سے دوسرے تمام نظریوں کو شکست دی جائے اور مسلمانوں پر اس باب میں جو خاص فریضہ عائد ہوتا ہے نہ صرف یہ کہ اس کا شعور و احساس ان کے اندر پیدا کیا جائے بلکہ اس شعور و احساس سے ان کے سینوں کو بھر دیا جائے۔

اس کے بعد جو کچھ کرنا ہوگا اور جس طرح کرنا ہوگا اس کی راہیں آپ پر خود بخود کھل جائیں گی۔ والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا و ان اللہ مع المحسنین والسلام علی من اتبع الھدیٰ۔

مطبوعات دار الاشاعت نشاۃ ثانیہ حیدرآباد دکن

۱- ذہنی زلزلے .... عہ ۴/
۲- اسلام کا سیاسی نظریہ اور فلاح عالم ... ۸/
۳- دین حق ۶/
۴- راہ عمل ۶/
۵- نماز کی حقیقت ۸/
۶- قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں عہ ۸/
۷- اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر حصہ اول عہ
۸- اسلامی نظام .... سعہ
۹- علماء اور اسلام ۱۲/
۱۰- اسلام کی راہ راست اور انحراف کی راہیں ۸/
۱۱- کلمہ طیبہ کے معنی ۲/

۱۲- مسلمان کسے کہتے ہیں ....
۱۳- ایمان کی کسوٹی ....
۱۴- عبادت ....
۱۵- خدا کی اطاعت کس لئے ....
۱۶- اسلامی تحریک ....
۱۷- مسلمان کا بنیادی عقیدہ چارٹ بڑا ....
۱۸- ایضاً چھوٹا خوبصورت چارٹ ....
۱۹- ایضاً جیبی پمفلٹ ۲
۲۰- مسلمان کی پہچان ۵
۲۱- اسلام کا استغاثہ ۴
۲۲- لباس کا مسئلہ ۴

ملنے کا پتہ :-

دار الاشاعت نشاۃ ثانیہ جدید ملے پلی

حیدرآباد دکن